مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۱ | ذی الحج ۱۴۴۱ھ | اگست ۲۰۲۰ء | شمارہ ۷

تعظیم العلم مع تقسیم العلم
علم کی تعظیم و تقسیم

از افادات
حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ
عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے
زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور
35422213
35433049
پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

تعظیم العلم مع تقسیم العلم
(علم کی تعظیم و تقسیم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے یہ وعظ بمقام دہلی مدرسہ عبدالرب ۱۷ شعبان ۱۳۴۰ھ بروز یک شنبہ ۳ گھنٹہ ۵ منٹ کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۳۵۰ تھی۔ اس وعظ میں توحید کو بیان کرنے کے ساتھ بندے پر اللہ کے انعامات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ تعظیم علم اور تقسیم علم کی بھی وضاحت فرمائی۔ یہ وعظ علامہ مولانا ظفر احمد تھانوی، صاحب اعلاء السنن نے قلمبند فرمایا۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۹ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

تعظیم العلم مع تقسیم العلم
(علم کی تعظیم و تقسیم)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	وعظ کا اصل مقصود	۹
۲	دلائل توحید	۱۰
۳	مسئلہ تصور شیخ	۱۱
۴	ایک فطری امر	۱۱
۵	اکثر اشکالات کا سبب	۱۲
۶	ضال کے معنی و مفہوم	۱۳
۷	گمراہ اور تسخیر کے دو معنی	۱۴
۸	شرفِ انسان کا مبنیٰ	۱۶
۹	شرف نسب پر فخر جائز نہیں	۱۶
۱۰	ہر انسان کی استعداد	۱۷
۱۱	اشرف المخلوقات کا مطلب	۱۷
۱۲	تفسیر عجیب	۱۷
۱۳	انسان کی مثال	۱۸
۱۴	خلق عالم کا مقصود	۲۰
۱۵	انسان کا کام	۲۰
۱۶	اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب	۲۲
۱۷	موجد کا کام	۲۳
۱۸	متعدد عبادات میں حکمت	۲۶
۱۹	کسی ایک حالت پر انسان کو قرار نہیں	۲۷

۲۰..........	انسان کی چلبلی طبیعت....................................	۲۷
۲۱..........	انسان کی حالت..	۲۸
۲۲..........	بچوں کی ضد...	۲۹
۲۳..........	تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے.........................	۲۹
۲۴..........	اللہ تعالیٰ کی رحمت عظیمہ...............................	۳۰
۲۵..........	مستقبل کی باتوں کے پہلے جاننے کا انجام.............	۳۱
۲۶..........	میزبان کے لیے ایک ضروری ہدایت.....................	۳۳
۲۷..........	حضرت امیر معاویہؓ اور ایک بدوی کی حکایت...........	۳۳
۲۸..........	جنت کو پہلے پیدا کرنے میں حکمت.......................	۳۴
۲۹..........	معبود ہونے کے لیے خالق ہونا ضروری ہے............	۳۵
۳۰..........	اہل عرب وجود صانع کے منکر تھے........................	۳۶
۳۱..........	سارا قرآن دلائل توحید سے بھرپور ہے..................	۳۷
۳۲..........	عبادت کی فرد اعظم توحید ہے............................	۳۸
۳۳..........	نعمت کی دو قسمیں..	۳۹
۳۴..........	نعم باطنیہ...	۴۰
۳۵..........	بالغ احکام شرعیہ کا مکلّف ہے............................	۴۱
۳۶..........	جدال کی دو قسمیں..	۴۳
۳۷..........	ایک مدفاضل کی حکایت..................................	۴۳
۳۸..........	ایک لطیفہ..	۴۵
۳۹..........	انبیاء واولیاء مصیبت سے پریشان نہیں ہوتے	۴۶
۴۰..........	زاہد صحابیؓ کی حکایت....................................	۴۷
۴۱..........	حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا مذاق.....................	۴۸
۴۲..........	یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے..............	۴۸
۴۳..........	حکایت حضرت شبلی..	۵۰

۴۴	یک دم بہ خدا بودن کا مفہوم	۵۱
۴۵	حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا سلطنت کی عجیب تفسیر	۵۱
۴۶	حضرات صحابہؓ اور بعض اولیاء امت کی شان	۵۲
۴۷	مولانا جامی اور حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی حکایت	۵۲
۴۸	کاملین کے پاس دنیا کی حقیقت	۵۴
۴۹	حضرت امام اعظم کی اپنے صاحبزاہ کو نصیحت	۵۵
۵۰	آدمیت روح انسانی پر موقوف ہے	۵۶
۵۱	حقیقی اور نقلی انسان کا فرق	۵۷
۵۲	اعتبار کا فرق	۵۸
۵۳	شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہنے والے علماء کی حکایت	۵۸
۵۴	تحصیل علم کی اصل غرض محض رضاء الٰہی ہے	۵۹
۵۵	ایک فضول بحث میں اضاعت وقت	۶۱
۵۶	اعانت معصیت بھی گناہ ہے	۶۲
۵۷	مفتی کو مسائل کا تابع نہ ہونا چاہیے	۶۲
۵۸	مسئلہ بتلانے میں مولانا عبدالقیوم کا معمول	۶۳
۵۹	مسائل کی تحقیق میں حضرت حاجی صاحب کا ارشاد	۶۴
۶۰	حضرات اکابر دیوبند کی بے نفسی	۶۵
۶۱	حضرت شیخ الہند کی ظرافت	۶۶
۶۲	نااہل کو علم دین پڑھانے کا انجام	۶۷
۶۳	اہل مدارس سے خطاب	۶۸
۶۴	جدال فی اللہ سب سے زیادہ مذموم ہے	۶۹
۶۵	بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کا طریق	۷۰
۶۶	مستورات کے لیے طریق تحصیلِ علمِ دین	۷۱

۶۷	غرض پرستی کے بھیانک نتائج	۷۲
۶۸	ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ	۷۳
۶۹	استخلاف کی غایت	۷۴
۷۰	آمین کہنے والا دعا میں شریک ہوتا ہے	۷۵
۷۱	مسلمان کی اصل کامیابی	۷۷
۷۲	صراط مستقیم ہونے کا نفع	۷۷
۷۳	جنٹلمینوں کا عجیب مرض	۷۸
۷۴	شریعت پر عمل کرنے والا بادشاہ ہے	۷۹
۷۵	سلطنت تقرب الی اللہ کا سبب نہیں	۸۰
۷۶	ایک پردیسی مولوی کی حکایت	۸۰
۷۷	حرص وطمع کا انجام	۸۱
۷۸	ایک لطیفہ شب دیگ	۸۲
۷۹	شیخ ابن عربی کا مقام	۸۲
۸۰	امام غزالی کی وقعت وعظمت	۸۳
۸۱	علم حقیقی کی شان	۸۴
۸۲	علم حقیقی حاصل کرنے کا طریق	۸۴
۸۳	ایک گودنے والے کی حکایت	۸۶
۸۴	مشائخ کاملین کا مشفقانہ آپریشن	۸۶
۸۵	ضرورت علمِ نافع	۸۷
۸۶	جملہ علوم درسیہ کی ضرورت	۸۸
۸۷	اقسام علم	۸۸
۸۸	خلاصہ وعظ	۸۹
۸۹	اخبار الجامعہ	۹۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارك وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

(أَلَمۡ تَرَوۡا أَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُم مَّا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الۡأَرۡضِ وَأَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً وَّمِنَ النَّاسِ مَن یُجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَلَا ھُدًی وَلَا کِتَابٍ مُّنِیۡرٍ)(۱)

وعظ کا اصل مقصود

یہ ایک آیت ہے سورہ لقمان کی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بعض دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے اس لیے اس کو مجادلہ (۲) سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعض انواع (۳) کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً (۴) اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور (۵) ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہوجائے گا۔ پس یہ آیت

(۱) ''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لیے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں۔ بدون علم کے اور بدون ہدایت کے اور بدون روشن کتاب کے'' سورۃ لقمان: ۲۰ (۲) جھگڑے سے تعبیر کیا (۳) اقسام (۴) یہ آیت ان معنی کے لیے ظاہری دلالت نہیں کرتی (۵) مگر یہ معنی اس سے سمجھ میں آرہے ہیں۔

توحید پر تو صراحتاً دلالت (۱) کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارۃً دلالت کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ مناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لیے دوسرے مضمون کو جو اشارۃً اس آیت سے مستنبط ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی ہے لیکن ربط کے لیے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آوے گی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے۔ مگر پہلے جزو کا بیان محض ربط ہی کے لیے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے۔

دلائل توحید

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۲) اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لیے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں۔ یہاں سَخَّرَ لَكُمْ کے معنی وہ مراد نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں۔ لیکن منشاء اس اشکال کا محض غلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (پھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لیے۔ بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لیے ان کو قرآن میں اشکال پیش آجاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات ولغت میں فرق جانتے ہیں۔ البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ ومحاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو ''مسخر کر دیا تھا تمہارے لیے'' پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط

(۱) یہ آیت معنی توحید پر صراحتا دال اور علم کی اقسام پر اشارۃ دال ہے (۲) سورۃ لقمان: ۲۰

ہوگیا اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بسے ہوئے ہیں جو محاورہ اردو میں مستعمل ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔

مسئلہ تصور شیخ

جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھ کر دی تھی۔ مسئلہ تصور شیخ صوفیاء کا ایک شغل ہے(۱) جو زمانہ قدیم میں رائج تھا لیکن اب محققین نے اس شغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہوگئی ہے۔ بہت لوگ اس شغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اس کی تعلیم کا مضائقہ نہیں۔ رفع خطرات وحصول یکسوئی کے واسطے یہ شغل بہت نافع ہے۔(۲) غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نو وارد طالب علم جو اب تک معقول (۳) میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو، میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلا ہے ہی تھے سو اس کا منشاء یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بوعلی سینا ایسا بسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ سن کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوتا تھا۔ دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شیخ ہوسکتا ہے۔

ایک فطری امر

یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف

(۱) مراقبہ (۲) مفید (۳) عقلی علوم منطق وغیرہ پڑھنے میں مشغول تھے۔

انتقال ذہن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم (۱) لوگوں نے صفات الٰہیہ (۲) کو اپنی صفات پر قیاس کیا، قرآن میں حق تعالیٰ کے لیے وجہ ویدوسمع وبصر ورحمت وغضب (۳) وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسیم (۴) کے قائل ہوگئے اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ (۵) ہی بسی ہوئی ہیں اس لیے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوگیا۔

جنگ ہفتا دو دو ملت ہمہ را عذر بند چو ندیدند حقیقت راہ افسانہ زدند (۶)

اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا۔ پس قرآن میں سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ ''مسخر کردیا تمہارے واسطے'' دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لے کر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع ومطیع ومنقاد (۷) کرنے کے ہیں۔

اکثر اشکالات کا سبب

اور ظاہر ہے کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں ہماری تابع ومطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آرہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین وآسمان کی تمام چیزیں اس معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں (۸) ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع ومطیع نہیں ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق کئے۔ اس سے یہ اشکال پیدا ہوا

(۱) کم عقل (۲) اللہ کی صفات کو (۳) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لیے چہرے، ہاتھ، سننے، دیکھنے، رحمت اور غصہ کے الفاظ دیکھ کر (۴) اللہ کے لیے جسم کے قائل ہوگئے کہ ہماری طرح اس کا بھی جسم ہے (۵) انسانی صفات (۶) ''بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی'' (۷) فرمانبردار (۸) ہمارے تابع نہیں۔

حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنی لیتا تو یہ اشکال نہ پڑتا۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اکثر اشکالات کا سبب یہی ہے کہ لوگ حقائق کو تو سمجھتے نہیں محض غلط محاورات سے شبہ میں پڑ جاتے ہیں۔

ضال کے معنی و مفہوم

چنانچہ ایک شخص تھانہ بھون میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے قرآن پر کچھ شبہ ہے جس کو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے آپ اس آیت کا ترجمہ کر دیجئے۔ ''وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى'' میں سمجھ گیا کہ اس کو کسی ترجمہ کے دیکھنے سے اشکال پیش آیا ہے۔ میں نے کہا سنئے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اور پایا خدا تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا'' یہ ترجمہ سن کر وہ میرے منہ کو تکنے لگے، میں نے کہا فرمایئے وہ کیا اشکال ہے کہنے لگے اب تو کچھ بھی نہیں۔ سو منشاء اشکال کا یہ تھا کہ بعض مترجمین نے اس آیت کے ترجمہ میں یہ لکھ دیا ہے کہ پایا آپ کو گمراہ الخ اور غالباً اس زمانہ میں اردو کا محاورہ گمراہ کے بارے میں فارسی محاورہ کے موافق ہوگا۔ فارسی میں گمراہ ناواقف کو بھی عام ہے۔ یہی محاورہ اس وقت اردو کا بھی ہوگا۔ اس لیے ان حضرات نے ضال کا ترجمہ اس جگہ گمراہ سے کر دیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اردو محاورہ فارسی کے مطابق اس وقت بھی نہ ہو لیکن مترجم نے فارسی محاورہ کا لحاظ کر کے یہ ترجمہ کیا ہو اور عوام کی گمراہی کا اندیشہ اس لیے نہ ہوا کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے کہ عوام کو ترجمہ قرآن کسی عالم استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے تو ان کو اطمینان تھا کہ پڑھاتے ہوئے ہم بتلا دیں گے کہ اس جگہ فارسی محاورہ کے موافق یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لیے انہوں نے آزادانہ یہ لفظ لکھ دیا لیکن اب اردو کا محاورہ بدل گیا ہے آج کل گمراہ محض ناواقف کو نہیں کہتے بلکہ یہ لفظ اس زمانہ میں مذمت کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی جو شخص بعد وضوح (اللہ تعالیٰ کا راستہ واضح ہونے کے بعد) راہ حق کے اس راہ کو چھوڑ دے۔ نیز آج کل عوام ترجمہ قرآن کو علماء سے سبقاً سبقاً پڑھتے بھی نہیں اس لیے ان کو اشکالات پڑتے ہیں کہ انہوں نے گمراہ کا لفظ دیکھا جو کہ فارسی لفظ ہے اور معنی لیے اردو محاورہ کے موافق اس وجہ سے شبہ پیدا ہوا حالانکہ ان کو

لازم تھا کہ جو لفظ جس زبان کا ہے اس کے معنی اسی زبان کے محاورہ کے موافق لیتے۔

گمراہ اور تسخیر کے دو معنی

پس سمجھنا چاہیے کہ گمراہ کے دو معنی ہیں ایک وہ جس کو راستہ معلوم ہی نہ ہو اس معنی کے لیے آج کل اردو میں ناواقف کا لفظ مستعمل ہے۔ (استعمال کیا گیا) دوسرے وہ جو بعد بتلانے کے بھی غلط راستہ پر چلے اور عربی میں لفظ ضال بھی ان دونوں معنوں میں مستعمل ہوتا ہے اس آیت میں ضال اور گمراہ سے پہلے معنی مراد ہیں۔ یعنی ناواقف جس پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس واقف بنادیا اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام علوم حق تعالیٰ ہی کے بتلانے سے حاصل ہوئے، اس میں کیا اشکال ہے اور دوسرے معنی جو ضال اور گمراہ کے ہیں وہ اس آیت میں ممتنع الارادہ ہیں(۱) وہ ہرگز مراد نہیں خود سمجھ لو تو جس طرح غلط محاورہ کی وجہ سے اس میں اشکال پڑا تھا اسی طرح یہاں بھی ممکن ہے کہ کسی کو اشکال پیش آیا ہو کیونکہ تسخیر کے معنی ہمارے محاورہ میں یہ ہیں کہ کسی کو ایسا تابع کردیا جائے کہ جو ہم کہہ دیں وہی کرنے لگے جیسا کہ تسخیر کے لیے تعویذ گنڈے لکھوائے جاتے ہیں اور وہاں تسخیر کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں کہ دوسرا شخص ہمارا ایسا منقاد (فرمانبردار واطاعت شعار) ومطیع ہوجائے کہ جو ہم کہیں وہی کرنے لگے۔ سو سمجھنا چاہیے کہ تسخیر کے صرف یہی معنی نہیں ہیں بلکہ عربی میں تسخیر کے ایک اور معنی بھی ہیں یعنی کام میں لگادینا اور اس آیت میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں پہلے معنی مراد نہیں کیونکہ زمین وآسمان کی تمام چیزیں ہماری منقاد و مطیع نہیں ہیں کہ جو ہم کہہ دیں وہی کرنے لگیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مہمان تمہارے یہاں آوے اور تم اس کی آسائش کے لیے اپنے نوکروں سے کام لو تو وہ نوکر مطیع تو تمہارے ہیں مگر تم نے اس وقت کام میں اس مہمان کے لگادیا تو تمہارے کہنے سے یہ پانچ چھ گھنٹے جو نوکر اس کے کام میں لگے رہے یہ بھی تسخیر ہے حالانکہ وہ اس کے نوکر نہیں بلکہ تمہارے مطیع ہیں تم نے صرف ان کو اس کے کام میں لگادیا ہے اور لغت عربیہ

(۱) وہ معنی اس آیت میں نہیں لیے جاسکتے

کے موافق کسی کو کسی کے کام میں لگا دینا بھی تسخیر کہلاتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے آسمان وزمین وغیرہ کو تمہارے واسطے کام میں لگا دیا ہے بس یہی تسخیر ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں تمہاری مطیع نہیں بلکہ ممکن ہے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو کہ ہم انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور انسان کو بھی خبر نہ ہو کہ میرے کام میں کون کون لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم کو ان سے منافع حاصل ہو رہے ہیں اور راحت پہنچ رہی ہے اور ان سے تمہارے کام چل رہے ہیں اس لیے دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے یعنی تمہارے کام میں لگا دیا ہے۔ پس اب سَخَّرَ لَكُمْ (مسخر کیا تمہارے لیے) میں تسخیر کے معنی وہ ہوئے جو شیخ سعدی نے ان شعروں میں بیان کیے ہیں۔

ابر وباد ومہ و خورشید وفلک درکارند تا تو نانے بکف آری وبغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ وفرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرمانبری

یعنی بادل اور ہوا اور چاند وسورج سب کے سب اپنے اپنے کام میں اس لیے لگے ہوئے ہیں کہ تم کو روٹی مل جاوے اور پیٹ بھر کے تم خدا کی عبادت میں لگو اور غفلت میں عمر نہ گزارو۔ دوسرے شعر میں از بہرِ تو کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے نفع کے لیے اور تمہاری خاطر سے یہ سب مختلف کاموں میں لگائے ہوئے ہیں اور جو کام جس کے سپرد ہے اس کو اچھی طرح ہر اک بجالا رہا ہے۔ بہرِ تو کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع کر دیا گیا ہے۔ پس از بہرِ تو سرگشتہ وفرمانبردار کے وہی معنی ہیں جو سَخَّرَ لَكُمْ کے ہیں۔ آگے بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں بری۔ یعنی جب یہ تمام چیزیں باطاعت احکام الٰہیہ تکوینیہ تیرے کام میں لگی ہوئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرے اوپر سب سے بڑی حق تعالیٰ کی نعمت ہیں کہ ان سب کو تیرے کام میں لگا رکھا ہے تو یہ بہت ہی بے انصافی ہوگی کہ احکام الٰہیہ تشریعیہ کی فرمابرداری نہ کرے کیونکہ جس قدر کسی پر منعم (نعمتیں عطا فرمانے والا) کا احسان زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس پر اس منعم کا شکر زیادہ واجب ہوتا ہے اور اگر وہ ناسپاسی (۱) کرے گا تو سب سے زیادہ

(۱) ناشکری۔

موردعتاب (۱) بھی ہوگا۔ پس انسان بھی اشرف المخلوقات اسی وقت ہے جبکہ وہ احکام الٰہیہ کا اتباع کرے ورنہ بصورت مخالف جمادات وحیوانات (۲) ہی اس سے اچھے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے احکام کی مخالفت تو نہیں کرتے۔

شرف انسان کا مبنی

(انحصار) اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شرف انسان کے لیے لوازم ذات (۳) سے نہیں بلکہ مبنی شرف کا اعمال ہیں (۴)۔ بعض لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ شرف کو لوازم ذات (۵) سے سمجھتے ہیں گو افعال کیسے ہی ہوں۔ بعض لوگ فخر کرتے ہیں کہ ہم شیخ ہیں یا سید ہیں اور اس بنا پر وہ اپنے کو دوسری قوموں سے مطلقاً افضل سمجھتے ہیں گو ان شیخ وسید صاحب کے اعمال جلاہوں سے بھی کبھی بدتر ہوں سو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انسان کے اعمال درست نہ ہوں تو وہ جلاہوں سے تو کیا افضل ہوگا وہ تو جانوروں سے بھی بدتر ہوگا۔ ''اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ''(۶) بناء شرف اعمال صالحہ وایمان ہے ورنہ۔

الناس من جهته التمثال اكفاء　　ابوهم ادم والام حواء(۷)

شرف نسب پر فخر جائز نہیں

البتہ اگر اعمال درست ہوں تو پھر شرف نسب بھی ایک درجہ میں باعث فضیلت ہوسکتا ہے لیکن اس پر فخر کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ ہاں تحدیث بالنعمۃ (اظہار نعمت) جائز ہے او اگر انسان ہوکر اعمال خلاف انسانیت کرے تو پھر فخر وشرف کیسا، ہاں اس صورت میں بھی استعداد تو اس کے اندر موجود ہے اگر اپنی استعداد کی طرف عود کرے (۸) تو پھر وہ اشرف المخلوقات ہے اور یہی محمل ہے (۹) اس آیت کا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۰)

---

(۱) سب سے زیادہ سزا کا مستحق ہوگا (۲) پتھر اور جانور (۳) تمام مخلوقات پر انسان کی فضیلت ذاتی نہیں ہے (۴) وجہ فضیلت اعمال ہیں (۵) انسان کے شرف کو ذات کا خاصہ سمجھتے ہیں (۶) ''یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بدتر ہیں'' (۷) ''یعنی صورت کے اعتبار سے سب آدمی یکساں ہیں کیونکہ سب کے سب آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں'' (۸) لوٹ آئے (۹) اس آیت میں یہی مراد ہے۔ (۱۰) ''ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا۔ سورۃ الاسراء: ۷۰

ہر انسان کی استعداد

اس آیت میں جو بنی آدم کو عموماً مکرم کہا گیا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان میں استعداد(۱) ایسی موجود ہے کہ اگر وہ اس سے کام لے تو پھر ساری مخلوق سے زیادہ مکرم ومحترم ہوسکتا ہے اور اگر اعمال بد ہوئے تو کچھ بھی نہیں۔ بہرحال انسان پر جب نعم الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) اور مخلوقات سے زیادہ ہیں تو نافرمانی واعمال بد کی صورت میں وہ دوسروں سے زیادہ مورد عتاب(۲) ہوگا کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس پر نعمتیں زیاہ ہوتی ہیں اس پر شکر بھی زیادہ واجب ہوتا ہے اور ناشکری کی صورت میں اس پر عتاب بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔ دیکھو رعایا میں سے ایک معمولی آدمی اگر احکام شاہی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس درجہ مورد عتاب (عتاب کے نزول کا سبب) نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک درباری آدمی خلاف ورزی احکام پر مورد عتاب ہوتا ہے۔

اشرف المخلوقات کا مطلب

الغرض انسان اشرف المخلوقات تو ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلوقات اس کی غلام ہے بلکہ اس کی مثال محض مہمان جیسی ہے کہ سارا سامان اسی کے واسطے ہوتا ہے مگر وہ مالک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے اور اشارہ کی صورت یہ ہے کہ اس آیت میں ایک قضیہ شرطیہ ہے جس کے مقدم وتالی میں بظاہر(۳) ربط نہیں ہے مگر اس مقدمہ کے ملالینے کے بعد ربط پیدا ہوجاتا ہے تو جس مقدمہ پر آیت کا مربوط ہونا موقوف ہے اس پر بھی آیت کی دلالت لازمی ہے۔ گو بطریق اقتضا ہی سہی۔

تفسیر عجیب

وہ آیت یہ ہے ''وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ''(۴)

(۱) صلاحیت (۲) دوسروں سے زیادہ مستحق سزا ہوگا (۳) انسان کی نافرمانی کی وجہ سے ساری مخلوق کا ہلاک ہونا سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا جواز ہے (۴) ''اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے۔

اس آیت میں بظاہر مقدم وتالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مواخذہ کرنے کا نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہوسکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ الْخَلْقَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عليها من دآبّة(۱)

یا یوں فرماتے : وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عليها من الانسان(۲) تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ واعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو۔ ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے مگر تقریر گزشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے کہ انسان کے لیے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں۔ بس اب ربط پیدا ہوگیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ سے ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لیے ہلاک ہوتیں کہ وہ سب انسان کے لیے پیدا ہوئیں تھیں اور قاعدہ ہے "الشئی اذا خلا عن غایته انتفی "(۳)

جب انسان ہی نہ رہا جس کے لیے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ، اس لیے یہ بھی ہلاک ہوجائیں گے۔

انسان کی مثال

الغرض انسان اس عالم میں بمنزلہ مہمان کے ہے اور حق تعالیٰ ہماری عادت کے موافق ہمارے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں اور معزز مہمان کے بارے میں ہماری عادت یہ ہے کہ مہمان کے آنے سے پہلے سب کام درست کردیا جاتا ہے اس کی نشست وبرخاست (۴) کے لیے کمرہ صاف اور درست کردیتے، بستر وغیرہ کا انتظام کردیتے اور تمام ضروریات کو پہلے سے مہیا کردیتے ہیں جس سے بعض دفعہ ناواقف دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ اس کمرہ کو اس قدر آراستہ وپیراستہ کیوں کیا جارہا ہے بلکہ ممکن ہے کہ کوئی

(۱) "اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے" (۲) "اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے" (۳) چیز جب غرض وغایت سے خالی ہوتی ہے تو منتفی ہوجاتی ہے (۴) اٹھنے بیٹھنے کی جگہ

نادان یہ سامان دیکھ کر یوں سمجھنے لگے کہ شاید مالک کو اس کمرہ ہی سے زیادہ محبت ہے اسی لیے وہ اس کو زیادہ آراستہ رکھنا چاہتا ہے یا اس سامان ہی کو مقصود سمجھا جائے کہ اس کا محفوظ کرنا اور قرینہ سے رکھنا ہی مالک کو منظور ہے مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ نہ اس کمرہ سے مالک کو کوئی خاص محبت ہے نہ اس سامان کی حفاظت مقصود ہے بلکہ یہ سب کچھ کسی کی آمد کے لیے انتظام ہے۔ چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب مہمان پہنچ جاتا اور اس تمام سامان میں تصرف کرنے لگتا ہے اس وقت حقیقت شناس کے خیال کی تصدیق ہوجاتی ہے لیکن نادان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ مہمان تو ایک یا دو ہفتہ کے بعد آیا اور سامان پہلے مکمل ہو چکا، کمرہ بہت پہلے سے آراستہ ہے تو وجود میں یہ سامان اور کمرہ کی آرائش مقدم ہے اور مہمان کی آمد مؤخر ہے(۱) اور مقدم مؤخر سے افضل (۲) ہوتا ہے اس لیے یہ سامان مہمان کے تابع نہیں۔ غرض یہ بیوقوف تقدیم وجود ہی کو باعث شرف سمجھتا(۳) ہے۔ پھر قاعدہ یہ ہے کہ مہمان کے چلے جانے کے بعد بھی سامان کو فوراً منتشر نہیں (۴) کیا جاتا اس سے نادان کو سامان کے مقصود ہونے کا اور زیادہ شبہ ہوجاتا ہے کہ تقدیم فی الوجود وتاخیر فی البقاء(۵) اس کی علامت ہے کہ یہ سامان مہمان کے واسطے نہیں ورنہ اس کے چلے جانے کے قبل ہی منتشر کردیا جاتا مگر عاقل کے نزدیک یہ بھی اسی کی علامت ہے کہ یہ سب سامان مہمان ہی کے واسطے تھا کیونکہ مہمان عزیز کے سامنے سامان کو منتشر نہیں کیا(۶) کرتے تاکہ اس کو ایک منٹ کے لیے بھی تکلیف نہ ہو، چلتے وقت تک سارا سامان اسی طرح آراستہ رکھا جاتا ہے اس کی رخصت کے بعد توقف سے سامان کو منتشر کیا کرتے ہیں۔ جب آپ کو معلوم ہوگیا کہ ہماری عادت مہمان کے واسطے یہ ہے تو آپ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے بھی ہمارے ساتھ اسی کے موافق برتاؤ کیا ہے۔ چنانچہ سورہ حم میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ تمام کائنات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہے اور دیگر آیات واحادیث سے یہ معلوم ہے کہ فنا(۷) پہلے انسان کا ہوگا اس کے بعد دوسری

(۱) کمرہ پہلے سجایا گیا اور مہمان بعد میں آیا (۲) جو پہلے ہو وہ بعد والے سے افضل ہوتا ہے (۳) وجودا مقدم ہونے کو فضیلت کا باعث سمجھتا ہے (۴) فورا ہٹایا نہیں جاتا (۵) پہلے موجود ہونا اور بعد تک باقی رہنا اس کی دلیل ہے (۶) مہمان کے سامنے سامان ہٹایا نہیں جاتا (۷) پہلے انسان ختم ہوں گے پھر باقی کائنات ختم ہوگی

کائنات فنا ہوں گی۔ اس سے نادان کو یہ غلطی ہوسکتی ہے کہ اگر انسان مقصود ہوتا اور یہ کائنات اس کے لیے پیدا ہوتی تو اس کی طرف توجہ بھی سب سے پہلے ہوتی حالانکہ اس کو سب کے بعد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ محض نادانی ہے۔

خلق عالم کا مقصود

کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ غایت ہمیشہ مقدم فی التصور اور مؤخر فی الظہور (۱) ہوا کرتی ہے تو انسان کا ظہور مؤخر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ توجہ بھی اس کی طرف بعد میں ہوئی بلکہ اصل مقصود خلق عالم سے انسان (۲) کا ظہور تھا لیکن حق تعالیٰ نے انسان کی آسائش کے لیے نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لیے کہ انسان ایک معزز مہمان ہے اس کی تمام ضروریات کو پہلے سے پیدا کر دیا یعنی بسائط کو۔ لیکن بسیط سے مراد یہ نہیں کہ وہ اشیاء بالکل ترکیب سے خالی ہیں فاقد الاجزاء ہیں (۳) بلکہ بسیط سے مراد یہ ہے جس میں ترکیب بصنعۃ العباد نہیں ہے (۴)۔ چنانچہ جتنی چیزیں انسان کی ضرورت کی تھیں ان کے اصول (۵) ہر وقت عالم میں موجود ہیں انسان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ ان میں ترکیب و تحلیل کر کے جو کچھ چاہے تیار کر لے (۶)، مثلاً درخت پہلے سے موجود ہیں، انسان نے آ کر اس کو کاٹا اور چیرا پھر لکڑی تختے کڑیاں وغیرہ بنالیں، خدا نے گیہوں پیدا کر دیا جس کو پیس کر آٹا بنایا جاتا اور پانی میں ملا کر گوندھا جاتا اور آگ پر رکھ کر روٹی پکائی جاتی ہے۔ اسی طرح جانوروں سے دودھ نکلتا اور اس سے گھی بنایا جاتا اور اس میں مٹھائی وغیرہ ملا کر حلوا تیار کر لیا جاتا ہے۔

انسان کا کام

اسی طرح تمام چیزوں میں غور کر لیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کا

(۱) مقصود ہمیشہ تصور میں پہلے اور وجود میں بعد میں آتا ہے (۲) ساری مخلوقات کو پیدا کرنے سے مقصود انسان کو پیدا کرنا تھا (۳) ایسا نہیں ہے کہ ان تمام چیزوں کے وجود میں کوئی ترکیب نہ ہو (۴) بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے کرنے سے ترکیب نہیں قائم ہوتی (۵) ان کا مادہ ہر وقت دنیا میں موجود ہے (۶) انسان ان کو صرف جوڑ توڑ کر چیزیں بنالیتا ہے۔

کام صرف تحلیل وترکیب ہے(۱) اعدام وایجاد(۲) انسان کا کام نہیں یعنی نہ وہ کسی چیز کو اپنے پاس سے وجود دے سکتا ہے نہ کسی کے وجود کو سلب(۳) کرسکتا ہے لیکن بعض لوگ تحلیل وترکیب ہی کو ایجاد واعدام(۴) سمجھتے ہیں اس لیے اپنے کو موجد کہنے لگے۔ چنانچہ نمرود کو یہی غلطی پیش آئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس نے وجود صانع پر دلیل کا مطالبہ کیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس کو جواب میں ایک کھلی ہوئی دلیل بیان فرمائی کہ ''رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ'' (کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے) تو نمرود کہنے لگا کہ میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قیدخانے سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا(۵) اس کو تو رہا کردیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کردیا۔ حالانکہ یہ احیاء واماتت نہ تھا(۶) کیونکہ احیاء کے معنی حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی، نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اماتت ازہاق(۷) روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کردی۔ اب یہ عادت اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کردینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کردینے سے جان نکل جاتی ہے۔ پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادت اللہ کے موافق نکل گئی، انسان کا اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریق اجزاء وعدم تفریق اجزاء کو احیاء واماتت(۸) سمجھا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کوڑ مغزی(۹) دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو عجز عن الفہم (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے عجز عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء واماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء واماتت میں داخل نہیں تو یہ کوڑ مغز اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لیے آپ نے دوسری دلیل

(۱) جوڑ توڑ (۲) کسی چیز کو پیدا کرنا اور بالکل معدوم کردینا (۳) ختم کرسکتا ہے (۴) جوڑ توڑ کا نام بعض لوگوں نے پیدا کرنا اور فنا کرنا رکھدیا (۵) ایک کو پھانسی کا حکم تھا (۶) یہ زندہ کرنا اور مارنا نہیں تھا (۷) روح نکالنے کا نام ہے (۸) اجزاء کو متفرق کرنے اور نہ متفرق کرنے کو حیات وموت سمجھا (۹) احمقانہ پن دیکھا

اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب

یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقلیہ ضروریہ ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس سے طرح سلسلہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا، تم نے اس انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا، تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا اس لیے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا ہے اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کے ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو ان ہی کی بات کا ماننا لازم ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم کرنا فی نفسہ ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم (۱) کی مصلحت سے جائز ہے۔ مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض (۲) بیان کی جس کو خصم نہیں سمجھ سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو سہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو (۳) کہ تسہیل (۴) کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت

(۱) فریق مخالف (۲) دقیق (۳) کم عقل (۴) آسانی کے بعد بھی

یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال(۱) کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال(۲) کیا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کوڑ مغز ہے اس لیے اس سے کیا امید تھی کہ وہ اماتت واحیاء کی حقیقت کو سمجھے گا اور جھک جھک نہ کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم وفہم ہوتا تو اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ ازہاق روح(۳) تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا۔ اس کے بعد روح کا نکل جانا عادۃ اللہ کے موافق ہوا، تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے ''القدرۃ تتعلق بالضدین'' کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے، جو شخص جان نکالنے پر قادر ہوگا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہوگا۔ پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیے کہ ایک شخص کی گردن جدا کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا، اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اس کوڑ مغز(۴) سے امید نہ تھی۔ غرض انسان کا کام محض تحلیل وترکیب ہے(۵)

موجد کا کام

ایجاد واعدام(۶) اس کا کام نہیں اور جو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں چیز کا موجد ہے نہ اطلاق محض مجازی ہے کیونکہ جتنی ایجادیں عالم میں ہوتی ہیں ان کے اجزاء بسیط(۷) پہلے سے موجود ہوتے ہیں ان اجزاء بسیطہ کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی نے پیدا نہیں کیا، موجد کا کام صرف اس قدر ہے کہ ان سے اجزاء میں ترکیب دیدی ہے۔ پس ظاہر میں اس کو صرف

(۱) اس دقیق دلیل سے دوسری دلیل کی طرف منتقل ہوجائے جو آسان ہو (۲) مخاطب کی رعایت کر کے دوسری دلیل بیان کی (۳) روح کا نکالنا (۴) احمق (۵) انسان صرف مرکب ہے موجد نہیں (۶) کسی معدوم کو موجود کرنا اور موجود کو معدوم کرنا انسان کا کام نہیں (۷) سب اجزاء۔

ہیئت ترکیبیہ اجتماعیہ کا (۱) موجد کہہ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ ہیئت اجتماعیہ کا مؤجد بھی مجازاً ہی ہے کیونکہ یہ قاعدہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوا کرتی ہے پس اگر ہیئت اجتماعیہ کا وجود اس شخص کے اختیار سے ہوا ہے تو لازم ہے کہ اس کو اس پر بھی قدرت ہو کہ اجزاء بسیطہ کو ملا دینے کے بعد ان پر ہیئت اجتماعیہ کو طاری نہ ہونے دیں حالانکہ کسی شخص کو اس پر قدرت نہیں بلکہ جب چند اجزاء کو باہم ترکیب دیا جائے گا ہیئت اجتماعیہ لزوماً طاری ہو جائے گی، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو، یہ اس کی صاف دلیل ہے کہ انسان کا کام بجز ترکیب کے اور کچھ نہیں نہ وہ بسیط کا موجد ہے نہ مرکب نہ ہیتہ اجتماعیہ کا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے لوہے اور مقناطیس کو باہم نزدیک کر دیا جائے کہ نزدیک کر دینا تو تمہارا فعل ہے اس کے بعد مقناطیس خود بخود اس کو جذب (۲) کر لے گا خواہ تم کتنا چاہو کہ جذب نہ کرے اب تمہارا کوئی اختیار نہیں۔ اسی طرح ترکیب کے بعد ہیتہ اجتماعیہ خود بخود فائض ہو جاتی ہے اب تم کو کوئی نہیں پوچھتا کہ تم ہو کون۔ ہاں حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ ترکیب کے بعد بھی ہیئت اجتماعیہ کو فائض نہ کرے۔ چنانچہ ایک پتھر ایسا ہے کہ جب اس کو سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھاگتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ مٹی کو سیال چیز میں ڈال دینے کا مقتضا تو یہ ہے کہ وہ ساکن ہو جائے اور دونوں مجتمع رہیں مگر یہاں خلاف مقتضا اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بدوں کسی مخلوق کے صنع (۳) کے وہ جدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ کے آثار کی حالت ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے بچا لیا حالانکہ اس اجتماع کا اثر اور مقتضا یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جل کر خاکستر ہو جاتے مگر حق تعالیٰ نے اس اثر کو رد کر دیا اور اس کے خلاف دوسرا اثر پیدا کر دیا۔ اسی طرح یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں عرصہ تک زندہ رکھا اور ان کو ہضم نہ ہونے دیا حالانکہ اس ترکیب واجتماع کا اثر ومقتضا یہ تھا کہ وہ مچھلی کے معدہ میں جا کر ہضم ہو جاتے اور زندگی ختم ہو جاتی۔ پس حقیقت میں ایجاد واعدام حق تعالیٰ ہی کا کام ہے، انسان کا کام صرف تحلیل

(۱) اس ترکیب کے بعد جو شکل بنے صرف اس کا موجد کہہ سکتے ہیں (۲) کھینچ لے گا (۳) بغیر عمل مخلوق

نے انسان کی تمام ضروریات کو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیا تھا کہ جب وہ دنیا میں آیا ساری ضرورت کی چیزیں اس کو تیار ملیں، صرف تحلیل وترکیب کرنا اس کا کام رہ گیا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

یا نبودیم وتقاضا ما نبود لطف تو ناگفتہ مامی شنود(۱)

ممکن ہے کہ اس پر کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ جب خدا تعالیٰ کو انسان کی ایسی خاطر منظور تھی اور وہ معزز مہمان تھا تو پھر اس کو یہ تکلیف بھی کیوں دی گئی کہ وہ ترکیب وتحلیل کرتا پھرے۔ بس تمام چیزیں کامل ومکمل اس کے واسطے موجود ہوتیں تو بہتر تھا۔ درختوں پر بجائے گیہوں کے روٹی لگا کرتی، کپاس کے بجائے بنے بنائے کپڑے پیدا ہوا کرتے، وعلیٰ ہذاالقیاس میں کہتا ہوں کہ اس میں حق تعالیٰ نے طبیعت انسانی کی بہت زیادہ رعایت کی ہے کیونکہ اس وقت تو گیہوں الگ پیدا ہوتا ہے اور چنا الگ تم کو اختیار ہے کہ خالص گیہوں کی روٹی پکالو یا خالص چنے کی یا دونوں کو ملا کر، نیز یہ بھی اختیار ہے کہ روٹی پکاؤ یا گیہوں ابال کر کھاؤ یا اس کو ستو بناؤ، سوہن حلوہ تیار کرو، غرض صدہا قسم کی چیزیں بنا سکتے ہو اور اگر بجائے گیہوں چنے کے دونوں کی روٹیاں پکی پکائی لگا کرتیں تو بس ایک ہی غذا تم کو نصیب ہوتی یہ رنگ برنگ کی غذائیں تم تیار نہ کر سکتے۔ اسی طرح روئی کے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کے موافق اس کا جیسا چاہے لباس تیار کر سکتا ہے۔ خواہ خالص سوت کا کپڑا بنائے یا سوت اور ریشم کا ملا کر یا اون اور سوت کو ملا کر نیز یہ بھی اختیار ہے کہ کرتہ بنائے یا پاجامہ یا قمیص یا اچکن اور اگر سلے سلائے کپڑے درختوں پر لگا کرتے تو بس وہ اسی کام آتے جس کام کے لیے وہ موضوع ہوتے، دوسرے لباس مختلف قسم کے تیار نہ ہو سکتے اور اگر ایسا ہو سکتا تو انسان ایک قسم کی غذا اور ایک ہی قسم کے لباس سے اکتا جاتا۔ چنانچہ اس کا تجربہ ایک زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو من وسلویٰ عطا فرمایا تھا کہ بے محنت ومشقت دونوں وقت ان کو بیٹھے بٹھلائے غذا مل جاتی تھی اور غذا بھی بہت نفیس تھی مگر ان سے ایک غذا پر رہا نہ گیا، آخر کو اکتا کر کہنے لگے: یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا

(۱) ''نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف وکرم بلا کہے ہوئے سنتا تھا''

رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ م بَقْلِهَا وَ قِثَّآءِ هَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا (۱)

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ (۲)

تو صاحبو! اگر حق تعالیٰ پکی پکائی روٹی آسمان سے اتارا کرتے تو آپ بھی چند روز میں بنی اسرائیل کی طرح اس سے گھبرا جاتے اس لیے انسان کی راحت اسی میں ہے کہ ترکیب وتحلیل کا کام اس پر چھوڑ دیا گیا کہ جس طرح چاہے اپنی طبیعت کے موافق جوڑ توڑ کرتا رہے جیسا کہ قاعدہ ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ہاتھ کا بنایا ہوا پان مزے کا نہیں لگتا تو ان کی راحت اور ان کا اعزاز یہی ہے کہ میزبان ان کے آگے پان دان لاکر رکھ دے کہ لو بھائی تم اپنے ہاتھ سے جیسا چاہو بنالو۔ پس جس طرح پان دان سامنے رکھ دینے کو ہر شخص غایت اعزاز سمجھتا ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس شخص نے میزبان کی تحقیر کی کہ اس کو پان لگانے کی تکلیف دی اسی طرح تحلیل وترکیب کو انسان پر چھوڑ دینے سے تکلیف اور بیقدری کا شبہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ حقیقت میں یہ بھی غایت اعزاز ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو ایک سی غذا ایک سے لباس پر مجبور نہیں کیا بلکہ مختلف اقسام وانواع کے استعمال کی اس کو گنجائش دی خاص خاص شرائط وحدود کے ساتھ جن کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

متعدد عبادات میں حکمت

کیونکہ انسان ایک حالت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے اور یہی حکمت ہے عبادات کے تنوع (۳) وتعدد میں بھی یعنی حق تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک ہی قسم کی عبادت مشروع نہیں فرمائی بلکہ رنگ برنگ کی عبادات ہیں۔ ایک وقت نماز ہے دوسرے

(۱) ''اے موسیٰ ہم سے ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوسکے گا۔ پس اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ہمارے لیے وہ چیزیں پیدا کرے جو زمین سے اگا کرتی ہیں، یعنی ترکاریاں اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز'' سورۃ البقرہ:۶۱ (۲) ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم عمدہ چیز کے بدلے ادنی کو لینا چاہتے ہو جاؤ کسی شہر میں اتر وہاں جو کچھ تم مانگتے ہو مل جائے گا'' (۳) مختلف اور متعدد عبادات ہیں۔

وقت تلاوت قرآن ہے ایک وقت تدریس وتعلیم ہے، کبھی وعظ ونصیحت ہے، کبھی استغفار درود شریف ہے اور پھر ہر حالت کے مناسب الگ الگ دعا بتلائی گئی ہے۔ وعلی ہذا القیاس تا کہ ایک عبادت سے انسان اکتا نہ جائے اور جدید عبادت سے اس کا شوق بڑھتا ہے۔

کسی ایک حالت پر انسان کو قرار نہیں

دیکھئے پہلے رمضان سردی میں تھا تو لوگ اس سے اکتاتے تھے کہ میاں یہ بھی کوئی روزہ ہے، ادھارے ادھارے بیٹھے ہیں نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے، ذرا سا دن ہے خبر ہی نہیں ہوتی کہ روزہ بھی تھا یا نہیں، لطف تو گرمی کے روزے کا ہے کہ ذرا خبر بھی ہو کہ ہاں روزہ ہے، پھر افطار میں شربت اور ٹھنڈے پانی کا اور بعض جگہ برف کا اہتمام ہوتا ہے، ٹھنڈے کنوؤں کی تلاش ہوتی ہے کہ جس کنویں کا پانی سب سے زیادہ ٹھنڈا ہو اس کا پانی لایا جاتا ہے، سردی میں تو یہ باتیں ہوتی تھیں، اب جب رمضان گرمی میں آیا تو اس سے بھی گھبرا گئے۔ چنانچہ اب رمضان آنے والا ہے معلوم ہوجائے گا کہ کتنے آدمی روزہ رکھتے ہیں۔ اب یوں کہتے ہیں کہ صاحب رات تو ذرا سی ہوتی ہے، تراویح پڑھنے کے بعد سونے کا موقع ہی نہیں ملتا، ادھر آنکھ لگی ادھر سحری کا وقت آیا، اتنی دیر میں افطار کے وقت کا کھانا پانی بھی ہضم نہیں ہوتا اب سحری میں کیا کھالیں، بس سحری کا لطف تو گرمیوں کی رات میں کچھ بھی نہیں۔ پھر دن ایسا پہاڑ کہ گھنٹے گنتے گنتے تھک جاؤ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا، پیاس کے مارے کلیجہ نکلا جاتا ہے پھر افطار کے وقت پانی اس بری طرح پیا جاتا ہے کہ تراویح پڑھنا محال ہوجاتا ہے بس گرمیوں میں نہ تراویح کا لطف ہے نہ روزہ کا لیجئے اب گرمیوں کے رمضان کی برائی ہونے لگی۔

انسان کی چلبلی طبیعت

غرض انسان کو کسی ایک حالت پر قرار وچین نہیں بس اس کو تو جنت ہی میں جا کر آرام ملے گا۔ مگر وہاں بھی اس کا چلبلا پن نہ جائے گا، ایک خدا کے بندے کو بیٹھے بٹھلائے کھیتی کا شوق ابھرے گا بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ جب تجھے بیٹھے بٹھلائے بے مانگے ہر چیز مل رہی ہے پھر تجھے کھیتی کی ضرورت کیا ہے کچھ نہیں صرف وہی چلبلا پن کہ

اس سے ایک حالت میں رہا نہیں جاتا، جنت میں جو بے محنت ومشقت کھانے کو ملے گا تو آپ کو اپنی وہی حالت یاد آئے گی کہ ایک وقت میں ہم کھیتی کر کے کھایا کرتے تھے یوں اناج بوتے ہی چلاتے کھیتی کاٹتے تھے۔ اب وہ بات ہی نہیں اس لیے اس کو کھیتی کا شوق ہوگا۔ چنانچہ یہ شوق بھی اس کا پورا کیا جائے گا۔ ادھر دانہ پڑا ادھر پیدا ہوا اور پکا اور تھوڑی دیر میں غلہ کا ڈھیر سامنے آجائے گا۔ پھر ارشاد ہوگا: ''دونك يا ابن آدم فلن يشبعك شيئ'' کہ اے ابن آدم لے (یہ کھیتی بھی تیار ہوگئی) مگر تجھے کوئی چیز سیر نہیں کرسکتی۔ قیاس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کوئی گاؤں کا رہنے والا کسان ہوگا جسے جنت میں بھی کھیتی ہی یاد آئے گی یا ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جسے دنیا میں بھی سلطنت وراحت ہی ملی ہو اور جنت میں تو جو کچھ ہے سلطنت ہی سلطنت ہے تو اس شخص کو دنیا میں کھیتی کا موقع نہ مل سکا اس نے یہ چاہا کہ لاؤ جنت میں اس آرزو کو پورا کرلوں کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ بعض دفعہ سلاطین غایت تکلیف اور سازو سامان وفرش وتخت سے گھبرا جاتے ہیں، غرباء کے گھر جا کر بوریئے اور ٹوٹے ہوئے پلنگ پر بیٹھنے اور موٹی جھوٹی روٹی ان سے مانگ کر کھاتے تھے، یہ کہتے تھے کہ عیش وآرام اور تکلف سے طبیعت گھبرا گئی اس لیے سادگی کا مزہ چکھنے کے لیے کبھی کبھی جی چاہا کرتا ہے اب آپ نے دیکھا کہ انسان کی طبیعت ایسی چلبلی ہے کہ جس آسائش وآرام کا یہ ساری عمر طالب رہتا ہے جب وہ میسر ہوجاتا ہے تو اس سے بھی اس کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔

انسان کی حالت

اسی واسطے خدا تعالیٰ نے انسان کی مرضی ونامرضی پر کچھ نہیں رکھا بلکہ سب کام اپنے قبضے میں رکھا ہے کیونکہ انسان کی حالت بچوں کی سی ہے۔ اب بچے اگر ایسی ویسی فرمائش کرنے لگیں تو کیا باپ ان کی ہر فرمائش کو پورا کردیا کرتا ہے ہرگز نہیں بلکہ باپ اپنی مرضی کے موافق کام کرتا ہے، بچوں کی مرضی پر اگر ہر کام چھوڑ دیا جائے تو اس میں ان کی ہلاکت اور بعض دفعہ اسی خلاف حکمت ہونے کے سبب بچوں کی ضدیں اور فرمائشیں پورا کرنا بھی بہت مشکل ہوجاتا ہے بعض دفعہ یہ ایسی ضدیں کرتے ہیں کہ

والدین کو تنگ کر دیتے ہیں۔

بچوں کی ضد

چنانچہ ہمارے یہاں ایک بچہ نے رونا شروع کیا، پوچھا کیا روتا ہے کہنے لگا مٹھائی لوں گا، جی مٹھائی دیدی، پھر رونا شروع کیا، بھائی اب کیوں روتا ہے، بولا دودھ لوں گا، دودھ بھی آ گیا۔ اسی طرح بہت سی سوچ سوچ کر فرمائشیں کیں اور پوری کر دی گئیں اس کو اس وقت مقصود والدین کو عاجز کرنا تھا۔ پھر اس نے رونا شروع کیا، پوچھا اب کیوں روتا ہے، کہنے لگا کہ ہائے یہ چاند کیوں نکل رہا ہے اس کو چھپا دو۔ اب اس ضد کو کوئی کیونکر پورا کرسکتا ہے، آخر ماں باپ عاجز ہو گئے۔

تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے

اسی واسطے بیربل اور اکبر میں ایک مرتبہ گفتگو ہوئی تھی، اکبر کہنے لگا کہ یہ جو مشہور ہے کہ تین ہٹوں کا پورا کرنا مشکل ہے، ایک راج ہٹ (۱)، ایک تریا ہٹ (۲)، ایک بالک ہٹ (۳)، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا، راج ہٹ اور تریا ہٹ کا دشوار ہونا تو مسلم ہوسکتا ہے کیونکہ بادشاہ اور عورت عاقل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی فرمائش کر بیٹھیں جس کا پورا کرنا دشوار ہو لیکن بالک ہٹ کا دشوار ہونا مسلم نہیں (۴) کیونکہ بچوں کی ایسی کیا فرمائش ہوگی جو پوری نہ ہوسکے۔ بیربل نے کہا کہ سب سے زیادہ مشکل تو بالک ہٹ ہی ہے اس کو بڑا ہی عاقل پورا کرسکتا ہے ہر شخص پورا نہیں کرتا۔ اکبر نے کہا کہ اس کے لیے عقل کی یا ضرورت ہے، بچوں کی فرمائش کو ہر شخص پوری کرسکتا ہے۔ بیربل نے کہا کہ اچھا ہم بچہ بنتے ہیں آپ میری ضد کو پورا کریں، اس نے کہا اچھا اب بیربل بچہ بنا اور بچوں کی طرح سسکنے لگا (اکبر کا دربار ایسا ہی ہوتا تھا وہاں یہی خرافات ہوا کرتی تھیں) غرض اکبر نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو، بیربل نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے، اکبر نے فوراً ہاتھی خانہ سے ایک ہاتھی منگوا دیا اور کہا سبحان اللہ آپ نے بڑی مشکل فرمائش کی، بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے کہ ہم تو کلھیا (۵) لیں گے، اکبر نے فوراً

(۱) بادشاہ کی ضد (۲) عورت کی ضد (۳) بچے کی ضد (۴) بچے کی ضد کا پورا کرنا مشکل ہے سمجھ میں نہیں آتا (۵) چھوٹا سا مٹی کا گول برتن

بازار سے ایک کلھیا بھی منگادی اور کہا بس یہی بڑی مشکل ضد تھی، بیربل پھر رونے لگا پوچھا اب کیوں روتا ہے، کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو اس کلھیا میں رکھ دو، اب تو اکبر کی عقل حیران ہوگئی کہ واقعی اس ضد کا پورا کرنا مشکل ہے، آخر عاجز ہوگیا اور مان گیا کہ بچوں کی فرمائش کا پورا کرنا مشکل ہے پھر اس نے بیربل سے کہا کہ یہ جو تم نے کہا تھا کہ عاقل بچوں کی ضد بھی پوری کرسکتا ہے۔ اب میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی اس فرمائش کو عاقل کیونکر پورا کردے گا۔ بیربل نے کہا کہ اگر عقل ہو تو سب آسان ہے، اکبر نے کہا اچھا اب ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد کو پورا کرو۔ اس نے کہا بہتر ہے، چنانچہ اب اکبر نے سسکنا شروع کیا، بیربل نے کہا کیوں روتے ہو، آپ نے کہا ہم تو ہاتھی لیں گے (میاں کو بس یہی سبق یاد تھا گھر کی عقل تو تھی ہی نہیں) بیربل نے ایک آدمی کو بھیجا کہ بازار سے جاکر مٹھائی یا مٹی کا ایک ہاتھی ذرا سا لے آؤ، چنانچہ لایا گیا اور اکبر کو دیدیا گیا، اب آپ نے پھر رونا شروع کیا، پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا ہم تو کلھیا لیں گے اس نے کلھیا بھی منگادی، پھر آپ رونے لگے پوچھا اب کیوں روتے ہو کہنے لگا کہ اس ہاتھی کو کلھیا میں رکھ دو، اس نے اٹھا کر رکھ دیا، بس اکبر خاموش ہوگئے۔ بیربل نے کہا کہ یہ آپ کی عقل مندی تھی کہ بچہ کے ہاتھی مانگنے پر آپ نے اتنا بڑا ہاتھی منگادیا۔ آپ کو چاہئے تھا کہ بچہ کی فرمائش کو اس کی حیثیت کا لحاظ کرکے پورا کرتے۔ الغرض بچے بڑی الٹی الٹی ضدیں کیا کرتے ہیں، بعض دفعہ بچہ یہاں تک چاہتا ہے کہ آگ پکڑلوں، سانپ کو ہاتھ میں لے لوں مگر ماں باپ اس کی اس خواہش کو پورا نہیں کردیتے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت عظیمہ

اسی طرح یہ بھی خدا کی رحمت عظیمہ ہے کہ حق تعالیٰ ہر فرمائش کے پورا کرنے پر قادر ہے۔ پھر بھی انسان کی خواہش کا اس لیے اتباع نہیں کرتا کہ اس کو حکمت ہی کی خبر نہیں بلکہ انسان کی خواہش کو حق کے تابع رکھا گیا ہے ورنہ بڑا فساد عظیم برپا ہوتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۱) پس انسان کی مصلحت اسی میں ہے کہ اس کو اسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا

(۱) ''اگر حق تعالیٰ ان کی خواہشات کا اتباع کرتے تو زمین وآسمان سب فاسد ہوجاتے''

گیا ورنہ یہ اپنے ہاتھوں ہلاک ہوجاتا۔

مستقبل کی باتوں کے پہلے جاننے کا انجام

ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ حق تعالیٰ سے دعا کردیجئے کہ مجھ کو اپنے متعلق آنے والی بات کی خبر ہوجایا کرے۔ موسیٰؑ پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرمادیجئے کہ تیری مصلحت اسی میں ہے کہ تجھ کو آنے والی بات کی اطلاع نہ ہو، تیری مصلحتوں کو تجھ سے زیادہ ہم جانتے ہیں آپ نے اس شخص کو اطلاع کردی، اس نے پھر اصرار کیا کہ میرا جی بہت چاہتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر دعا کی جو قبول ہوگئی۔ چنانچہ اس کو آئندہ واقعات کی اطلاع پہلے ہی ہوجایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کو معلوم ہوا کہ میرا گھوڑا مرنے والا ہے، اس نے جلدی سے بازار میں جاکر فروخت کردیا اور نفع سے فروخت کیا اور اپنے جی میں بہت خوش ہوا کہ دیکھو اس علم سے میرا کتنا بڑا نفع ہوا کہ جانور میرے گھر میں نہیں مرا، دوسرے کے یہاں جاکر مرے گا اور مجھے اس کی قیمت مع شئ زائد وصول ہوگئی۔ پھر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اب میرا غلام مرنے والا ہے اس نے غلام کو بھی جاکر فروخت کردیا اور اپنے دل میں بہت ہی خوش ہوا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ اب میں خود مرنے والا ہوں اب تو بڑا پریشان ہوا کہ اپنے کو کہاں جاکر چھپادوں۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کے پاس دوڑا ہوا آیا کہ شاید وہ اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت بتلادیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اس شخص سے فرمادیجئے کہ اس نے اپنی موت اپنے ہاتھوں خریدی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کی تقدیر میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عرصہ میں اس کے گھر پر ایک مصیبت نازل ہوگی ہم نے اول اس کے جانور پر ڈالنا چاہا، اس نے ہوشیاری کرکے اس کو اپنے سے الگ کردیا، پھر ہم نے اس کے غلام پر اس کو ٹالنا چاہا اس نے اس کو بھی بیچ کر نفع حاصل کرلیا اب خود ہی رہ گیا ہے، لہٰذا اب وہ مصیبت اس کے اوپر ضرور آوے گی ٹل نہیں سکتی۔ اس سے کہہ دیجئے کہ بس اب حسن خاتمہ کی دعا کرے موت ضرور آوے گی۔ تو آپ نے دیکھا کہ انسان کی مرضی پر کام چھوڑنے کا کیا نتیجہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لے لی۔ بس حق تعالیٰ

کی یہی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے، کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہوجاتی ہے، غیب کا علم محیط شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر ودفع مضرت کا(۱) سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہوجاتا ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے: وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ۔(۲)

اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہوجاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شر(۳) کبھی بھی نہ کرتا (دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا الخ۔ اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیل حاصل ہونا استکثار خیر ورفع مضرت کا ضرور سبب ہوسکتا ہے اور اس قصہ میں جو اس شخص کو مصیبت پیش آئی اس کا سبب یہ تھا کہ اس کو علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ اخیر تک کی سب حالت معلوم ہوجاتی تو وہ جان لیتا کہ اگر میں گھوڑے اور غلام کو فروخت کروں گا تو پھر یہ بلا میرے اوپر آوے گی)

پس کشف کے بعض دفعہ وبال جان ہونے پر کوئی اشکال نہیں کیونکہ کشف میں علم محیط نہیں ہوتا ادھورا علم ہوتا ہے اور علم محیط بشر کے لیے حاصل ہونا محال بھی ہے اور اس جگہ اس سے بحث ہی نہیں بلکہ جس قدر غیب کا علم انسان کو ہوسکتا ہے اس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ بعض دفعہ وہ وبال جان ہوجاتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں، خوب سمجھ لو یہ ساری گفتگو اس پر شروع ہوئی تھی کہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر انسان کے لیے پکی پکائی روٹی اور سلے سلائے کپڑے پیدا ہوا کرتے تو وہ گھبرا جاتا کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں اچکن پیدا ہوتا اور آپ کا جی قمیص کو چاہتا ہو دوسرے وقت میں پاجامہ پیدا ہوا اور آپ کی طبیعت لنگی کو چاہتی ہے اور انسان اس سے بھی گھبرا جاتا ہے کہ کوئی چیز اس کے سر پر سوار ہوجائے۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اس کے سر پر سوار کوئی چیز نہیں وہ جیسا

(۱) خیر کی کثرت اور نقصان کو دور کرنے کا ذریعہ (۲) ''اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کرلیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہنچتی (۳) شر چھوٹا بھی نہ ہو

چاہے خود بنا سکتا ہے اور اگر کسی چیز کی ضرورت نہ ہو تو یہ بھی اختیار ہے کہ کچھ نہ بنائے۔ یہ حکمت ہے اس میں کہ حق تعالیٰ نے تحلیل وترکیب کا کام انسان پر چھوڑ دیا ہے۔

میزبان کے لیے ایک ضروری ہدایت

سر پر سوار ہونے سے مجھے اپنا ایک قصہ یاد آیا، ایک صاحب نے جو کہ میرے دوست کے بیٹے ہیں، میری دعوت کی تھی، وہ بندہ خدا کھانا کھاتے ہوئے میرے سر پر سوار ہوگئے، بار بار مجھے ٹوکیں کہ مولانا آپ تو بہت کم کھاتے ہیں، اچھی طرح کھایئے، تکلف نہ فرمایئے، اب وہ تو مجھے زیادہ کھانے کو فرمارہے تھے مگر میری یہ حالت کہ جب مجھے اس کا تصور آتا کہ میزبان میرے لقموں کو دیکھ رہا ہے مجھ سے غیرت کی وجہ سے لقمہ نہ ٹوٹتا، آخر کار میں بھوکا ہی رہا اور اپنے گھر آکر میں نے دوبارہ کھانا کھایا۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے میری دعوت کی وہ ہر چیز مجھے اپنے آپ کھلاتے تھے مگر میری طبیعت اندر سے گھٹتی جاتی تھی۔ یہ آداب معاشرت کے بالکل خلاف ہے۔ میزبان کو چاہیے کہ مہمانوں کو کھاتے ہوئے ہرگز نہ گھورے۔ بس سرسری نگاہ سے اتنا معلوم کرتا رہے کہ کہاں کس چیز کی ضرورت ہے۔ باقی نہ اس سے کہے کہ آپ کم کھا رہے ہیں نہ یہ کہے کہ آپ تکلف کر رہے ہیں کیونکہ جب مہمان کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ میزبان میرے لقمے دیکھ رہا ہے تو اس سے بالکل نہیں کھایا جاتا۔

حضرت امیر معاویہؓ اور ایک بدوی کی حکایت

ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے دستر خوان پر ایک بدوی بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا تھا اور دیہاتیوں کی طرح بڑے بڑے لقمے بنا رہا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے خیر خواہی کے طور پر اتنا فرمادیا کہ اے شخص اپنی جان پر رحم کر اور لقمہ چھوٹا لے تاکہ گلے میں نہ اٹک جائے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ بدوی فوراً دستر خوان سے اٹھ کھڑا ہوا اور حضرت معاویہؓ سے خطاب کرکے کہا کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی شریف آدمی تمہارا کھانا کھاوے۔ تم مہمانوں کے لقموں کو تکتے ہو کہ کون چھوٹا لیتا ہے کون بڑا، تم کو اس سے کیا غرض تم کو دستر خوان پر مہمانوں کو بٹھلا کر پھر اپنے کھانے کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا چاہیے۔ یہ

کہہ کر چلتا ہوا۔ ہر چند حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا کہ کھانا اچھی طرح کھا کر جانا مگر اس نے ایک نہ مانی، خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں بیان یہ کر رہا تھا کہ انسان کی مثال معزز مہمان جیسی ہے کہ جس طرح اس کی آمد سے پہلے تمام ضروریات کا انتظام کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے تمام عالم کو اسی کی خاطر اور اسی کے واسطے پیدا کیا، پھر جب انسان ہلاک ہوجائے گا تو سارا عالم بھی ہلاک ہوجائے گا کیونکہ جس کے لیے یہ ساز وسامان تھا جب وہی نہ رہا تو اس کے رہنے میں کیا فائدہ۔

جنت کو پہلے پیدا کرنے میں حکمت

حق تعالیٰ نے آسمان وزمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہوگی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت وآسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو ادھر زیادہ رغبت ہوگی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ جنت تو ابھی بنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم(۱) کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی الوجود ہو اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے: ''اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ'' کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہوگی اور وہ اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالیٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی ''اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ'' (تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لینا مجاز ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلاوجہ معنی مجازی لینا جائز

(۱) غیر موجود

نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلادی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنا رہے ہیں کہ ''اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ'' (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کہ یہ فرماتے ''تعدوا للمتقین'' (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعۃ(۱) میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف رغبت ہے اور اس وقت شی معدوم کی طرف رغبت ہے(۲)۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آگئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔ الغرض ''سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ''(۳) میں تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے اور وہ معنی مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے (۴) ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے۔ اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے۔ گو تبعاً دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔

معبود ہونے کے لیے خالق ہونا ضروری ہے

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع وخالق (۵) کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیے کیونکہ معبود کے لیے کامل الصفات وجامع الکمالات (۶) ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے (۷) پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہوسکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا

(۱) ہر شخص جانتا ہے کہ ان دونوں سے طبیعت پر الگ الگ تاثر ہوگا (۲) موجود چیز کی طرف رغبت ہوگی جبکہ دوسری صورت میں جو چیز موجود ہی نہیں اس کی طرف رغبت پائی جائے گی دونوں میں فرق واضح ہے (۳) ''کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لیے تمام چیزوں کو جو آسمان وزمین میں ہیں'' (۴) سمجھ میں آتے ہیں (۵) بنانے والا اور پیدا کرنے والا (۶) معبود ہی ہوسکتا ہے جو صفات وکمالات میں کامل ہو (۷) تخلیق بہت بڑی صفت کمال ہے۔

کیونکہ خلق کے معنی اعطا وجود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطی وجود ہے (۱) یقیناً اس کے قبضہ میں خزائن وجود ہیں اور جس کے قبضہ میں وجود کے خزائن ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لیے حق تعالیٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے کیونکہ صفت خالقیت تمام کمالات کو مستلزم ہے (۲) حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں بیان فرمائے بلکہ نہایت سہل سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تدقیقات سے مخاطب ساکت تو ہوجاتا ہے مگر اس کی تسلی نہیں ہوتی (۳) اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہوجاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہے۔ اس عنوان سے ہر شخص کا ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر منطقی استدلالی طرز ہوتا تو اس سے اس درجہ تسلی نہ ہوسکتی۔ اس جگہ شاید کوئی یہ سوال کرے کہ حق تعالیٰ کا خالق ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے وجود صانع تو معلوم ہوجائے اور اس دلیل سے وجود صانع ثابت نہیں ہوتا۔

اہل عرب وجود صانع کے منکر تھے

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل عرب دہری نہ تھے وہ محض مشرک تھے وجود صانع (۴) کا وہ انکار نہ کرتے تھے اس لیے وجود صانع کو ثابت کرنے کا قرآن نے اہتمام نہیں کیا۔ ہاں علمائے اسلام نے جب دہریوں کا بھی ایک فرقہ اسلام کے مقابل دیکھا تو انہوں نے وجود صانع پر بھی دلائل قائم کئے۔ اہل عرب کا دہری نہ ہونا قرآن کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (۵)۔

(۱) وجود عطا کرنے والی ہے (۲) صفت خالقیت میں تمام کمالات پائے جاتے ہیں (۳) دقیق بات سنکر مخاطب خاموش تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی تسلی نہیں ہوتی (۴) پیدا کرنے والے کے وجود کے منکر نہ تھے (۵) ''اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں کو اور زمین، تو وہ یہ ضرور کہیں گے اللہ نے''

سارا قرآن دلائل توحید سے بھرپور ہے

اور اس قسم کا مضمون قرآن میں جابجا مذکور ہے۔ پس جب اہل عرب صانع (۱) کے قائل تھے اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ وکبریٰ وحد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا تا کہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی۔ سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارے میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقنائی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقنائی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقنائی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہوسکتے ہیں۔ بالخصوص دو موقعوں میں تو یہ انطباق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورہ بقرہ کی اس آیت میں: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲)

اس آیت میں چونکہ لفظ یعقلون موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لیے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انہوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے: ''لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' (۳)

---

(۱) بنانے والے خدا کے قائل تھے (۲) ''آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان وزمین کے درمیان ادھر ادھر پھیرنا عقلمندوں کے لیے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں'' (۳) ''اگر ان زمین وآسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہوجاتے''۔

عبادت کی فرد اعظم توحید ہے

(حاصل اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بداہۃ (ظاہری) بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر وتبدل کا مشاہدہ ہورہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود وعدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لیے وہ کسی مرجح کا محتاج ہے وہ مرجح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لیے بھی کسی مرجح کی ضرورت ہوگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لیے اس کو قطع کرنے کے لیے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح واجب الوجود ہے (جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے، وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے) یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سو اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر کامل ہونا ضروری۔ پہلی شق محال ہے کیونکہ عاجز ہوسکنے والا واجب الوجود نہیں ہوسکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا، مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کرسکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کرسکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کرسکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا۔ کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنی زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدیں لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہوگیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد

ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے(۱) خوب سمجھ لو۔ اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لیے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیات کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع (۲) ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فرد اعظم توحید ہے(۳) اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرما دیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے۔ اس نکتہ کی وجہ سے تمام قرآن میں جہاں توحید کی دلیل کا ذکر ہے وہاں نعمتوں کا ذکر ضرور ہے۔ چنانچہ اس آیت میں سَخَّرَ لَكُمْ میں لام منفعت سے انعام کی طرف اشارہ ہے اور آگے تو بالکل تصریح ہی کر دی۔

نعمت کی دو قسمیں

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں۔ اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ نعمت ظاہرہ وہ ہیں جو حواس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہوں اور نعمت باطنہ وہ ہیں جو عقل سے معلوم ہوں یا یہ جو حواس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے جو حواس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے۔ بہرحال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرما دی ورنہ نعم باطنہ

(۱) خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر دو خدا ہوں ایک ایک کام کرنا چاہے دوسرا وہ نہ کرنا چاہے تو یہ دوسرا پہلے کو روکنے پر قادر ہے یا نہیں اگر قادر ہے تو پہلا خدا نہیں اگر قادر نہیں تو دوسرا خدا نہیں کیونکہ خدا وہی ہے کہ جو کرنا چاہے کرے (۲) اللہ کی پیدا کردہ بھی ہیں اور ہمارے لیے نعمت بھی ہیں (۳) اللہ کی عبادت کرنے کی سب سے بڑی وجہ توحید ہے کیونکہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں تو اسی کی عبادت ہونی چاہیے اور منعم بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں لہٰذا اس اعتبار سے بھی اسی کی عبادت کی جائے۔

(باطنی نعمتوں) کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے بھی ہیں وہ نعم ظاہرہ کے برابر ان کی قدر نہیں کرتے۔

نعم باطنیہ

چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فرد اعظم اسلام ہے اب ذرا انصاف سے بتلایئے کہ اتنے بڑے مجمع میں ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی، ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ، بغض فی اللہ (۱) توکل ورضا وغیرہ یہ سب نعم باطنہ ہیں (۲) ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالیٰ نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ الا من شاء اللہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہوجاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے (۳) اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔ باطنہ فرمانے سے اس پر تنبیہ ہوگئی اور اس پر تنبیہ کی ضرورت بھی تھی کیونکہ بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہوگی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لیے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔

(۱) اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے عداوت کرنا (۲) یہ سب باطنی نعمتیں ہیں (۳) جس کے ذریعہ کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے۔

یہ جواب ایسا ہے جیسا کہ ایک بزرگ نے معتزلہ کے جواب میں بطور لطیفہ کے فرمایا ہے کہ معتزلہ جو رویت الٰہیہ کے آخرت میں منکر ہیں (۱) وہ بھی صحیح کہتے ہیں۔ ان کی بات کو رد کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بے چارے اپنا حال بیان کررہے ہیں کہ ہم آخرت میں رویت الٰہیہ سے محروم رہیں گے سو وہ اس نعمت سے محروم ہیں اس لیے وہ انکار میں معذور ہیں اور اہل سنت والجماعت جو رویت (۲) کے قائل ہیں وہ اپنے حال بیان کررہے ہیں۔ سو ان شاء اللہ ہم کو دیدار ہوگا اس لیے ہم اس کے قائل ہیں۔ الغرض عقل کے وجود میں بھی بعض لوگوں نے کلام کیا ہے اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نعمت پر متنبہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال عقل کے وجود پر دلیل صحیح اور کشف موجود ہے جس سے معلوم ہوگیا ہے کہ انسان کے اندر ایک نور ادراک ایسا ہے جو حیوانات کے اندر نہیں ہے اور اسی سے انسان حیوانات وغیرہ سے ممتاز ہے اور یہ عقل انسان کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتی ہے جو ابتداء میں اپنا کام نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں تمام قوی باطنہ قوی ظاہرہ کی تدبیر بدن (۳) میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل اپنا کام نہیں کرتی پھر جوں جوں بدن کی قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر عقل اپنا کام کرتی ہے حتی کہ بلوغ کے وقت شرعاً وہ کامل ہوجاتی ہے۔

بالغ احکام شرعیہ کا مکلّف ہے

اسی لیے شریعت نے بالغ کو احکام کا مکلّف بنایا ہے (۴) اس پر یہ اشکال نہ ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء بلوغ میں بھی اکثر لوگوں کو پوری عقل نہیں ہوتی پوری عقل تو ۳۰۔ ۴۰ سال کی عمر میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلوغ کے وقت عقل تو کامل ہوجاتی ہے لیکن تجربہ کم ہوتا ہے اور ۳۰۔ ۴۰ سال کی عمر میں تجربہ بھی کافی ہوجاتا ہے اس عمر میں کچھ عقل نہیں بڑھتی بلکہ تجربہ بڑھ جاتا ہے لیکن تجربہ کی وجہ سے اس کی باتوں میں اور اعمال میں پختگی اور استواری (مضبوطی) پیدا ہوجاتی ہے اس سبب سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال کی عمر میں عقل زیادہ ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ بھی

(۱) آخرت میں دیدار الٰہی کے منکر ہیں (۲) دیدار الٰہی کے قائل ہیں (۳) تمام باطنی قوتیں ظاہری اعضاء کی قوت بڑھانے میں مصروف ہوتی ہیں (۴) احکام کا پابند۔

ممکن ہے کہ اس عمر میں عقل ہی بڑھ جاتی ہو لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ بلوغ کے وقت عقل کامل نہیں ہوتی بس یوں نفع ونقصان کو سمجھ سکے پھر اس کے بعد دن بدن عقل کو ترقی ہوتی رہتی ہے مگر وہ ترقی تکلیف احکام کا موقوف علیہ (۱) نہیں مکلّف ہونے کے لیے وہی مقدار عقل کافی ہے جو بلوغ کے وقت عموماً ہوتی ہے اور یہاں سے منکرین معاد (۲) کی ایک غلطی معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض لوگ معادیات کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ امور محسوسہ نہیں ہیں۔ مثلاً جنت دوزخ کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا مشاہدہ نہیں ہوا تو ان کو اس تقریر سے سمجھنا چاہیے کہ بعض امور متفق علیہا مسلم عندالکل (۳) بھی ایسے ہیں جن کے وجود کا محض دلیل سے اعتقاد کیا گیا ہے اور ان کا مشاہدہ کسی نے آج تک نہیں کیا جیسے عقل اور روح وغیرہ کہ منکرین معاد بھی ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔ اب اگر ہر چیز کا وجود مشاہدہ کے بعد ہی تسلیم کیا جایا کرے تو پھر یہ لوگ عقل وروح کے وجود کے کیونکر قائل ہوگئے۔ پس معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا وجود یقینی ہے مگر مشاہدہ محسوس نہیں۔ اسی طرح جنت ودوزخ وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان اشیاء کا وجود بھی دلیل صحیح سے ثابت ہے لہٰذا اس کو تسلیم کرنا لازم ہے گو مشاہدہ کسی نے نہ کیا ہو اور جس طرح عقل نعم باطنہ میں سے ہے اسی طرح بعض علوم بھی جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے نعم باطنہ میں سے ہیں جیسے تمام علوم عقلیہ گو وہ منقول ہی ہوں ان کا ادراک عقل ہی سے ہوتا ہے حواس سے نہیں ہوسکتا کیونکہ نقل میں الفاظ کا ادراک سمع سے (۴) ہوتا ہے اور نقوش کا بصر (۵) سے لیکن معانی کا ادراک تو عقل ہی سے ہوتا ہے اور علوم نام معانی ہی کا ہے اسی طرح جس قدر باطنی حالات وکیفیات واخلاق ومقامات ہیں وہ بھی سب نعم باطنہ میں داخل ہیں اور یہ سب ظاہری اور باطنی نعمتیں حق تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں ان کے سوا صانع وخالق اور منعم کوئی نہیں (۶)۔ پس معبود بھی ان کے سوا کوئی نہیں۔ یہ حاصل ہے توحید کی دلیل کا آگے حق تعالیٰ منکرانِ توحید کی شکایت فرماتے ہیں: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ

(۱) احکام کی پابندی اس ترقی میں موقوف نہیں (۲) منکرین آخرت (۳) سب کے نزدیک تسلیم شدہ (۴) کان سے (۵) آنکھ سے (۶) بنانے والا پیدا کرنے والا اور تغیر دینے والا کوئی نہیں

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۱) یجادل فی اللہ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں'' سے مراد یجادل فی توحید (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے ہیں۔ اس آیت میں منکران توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں۔

جدال کی دو قسمیں

چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے (۲) کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے (۳) ایک جدال بالباطل (۴) جیسا کہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآن کے تتبع سے (۶) یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جدل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے۔ یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلتہ ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے۔ جیسا مشاکلتہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فرمایا گیا کیونکہ صورۃ دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ صورت کے یکساں ہونے پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک مولوی صاحب کی دستار بندی ہوئی تھی مگر وہ کسی قابل نہ تھے کتابیں سمجھ کر نہ پڑھی تھیں۔

ایک مد فاضل کی حکایت

دستار بندی کے وقت استاد سے کہنے لگے کہ اس وقت تو لوگ مجھے فاضل سمجھیں گے مگر میں حقیقت میں مد فاضل ہوں اگر لوگ مجھ سے مسائل دریافت کرنے لگے تو میں کیا کروں۔ استاد نے کہا کہ میں ایسی ترکیب بتلاتا ہوں جس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی بلکہ اور وقعت بڑھ جاوے گی۔ تم ہر سوال کے جواب میں یہ کہہ دیا کرنا کہ

(۱) ''یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں (۲) جھگڑنا ہی برا ہے (۳) حق کے لیے لڑنا (۴) باطل کے لیے لڑنا (۵) ''ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو'' (۶) قرآن میں غور کرنے سے (۷) ''برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے''۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے، اس کے بعد کچھ نہ کہنا ورنہ قلعی کھل جائے گی۔ تو اب دیکھئے یہ جواب ایسا ہے کہ اس کو بڑا محقق وسیع النظر بھی بیان کرسکتا ہے اور ایک جاہل بھی کہہ سکتا ہے۔ ظاہر میں دونوں کے جواب یکساں ہوں گے لیکن حقیقت شناس فرق کو سمجھ لے گا اسی طرح جدال بالحق و بالباطل کی صورت یکساں ہوتی ہے اس لیے دونوں پر جدال کا اطلاق یکساں کردیا جاتا ہے مگر حقیقت دونوں کی بالکل جدا ہے۔ چنانچہ اس واقعہ میں آخر ان مولوی صاحب کی قلعی ایک دن کھل ہی گئی۔ بات یہ ہے کہ سمجھنے والے لب ولہجہ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اس قول کا منشاء تحقیق اور وسعت نظر ہے یا جہل؟ محقق کے لہجہ میں جرأت اور استغناء کی شان ہوتی ہے اور ناقص اگر بڑی بات منہ سے نکالے گا تو اس کے لہجہ میں پستی اور کم ہمتی نمایاں ہوگی وہ محقق کی طرح جرأت کے ساتھ ایسی بات نہیں کہہ سکتا اس لیے کوئی پرکھنے والا سمجھ گیا کہ یہ مولوی صاحب جو ہر بات میں یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کچھ آتا واتا نہیں محض ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اس نے امتحان کے طور پر یہ پوچھا کہ مولانا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بارے میں کیا تحقیق ہے تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے بس ان کو یہی ایک جواب یاد تھا۔ جیسے ایک طوطی کا قصہ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کسی شخص نے اس کو یہ لفظ یاد کرادیا تھا۔ دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) اور بازار میں آکر دعویٰ کیا کہ یہ طوطی فارسی زبان جانتی ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا، ایک شخص نے اس کو خریدنا چاہا، مالک نے بہت قیمت بتلائی، اس نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تو اس قیمت کے لائق ہے جو یہ شخص مانگتا ہے۔ اس نے وہی کہا دریں چہ شک۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ واقعی طوطی فارسی خوب جانتی ہے دیکھو کیسا برمحل جواب دیا ہے اب تو خرید کر گھر لے گئے اور اس سے باتیں کرنے بیٹھے تو وہ ہر بات کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہتی چلی جاتی ہے، موقع ہو یا نہ ہو آخر اس نے جھلا کر کہا کہ میں نہایت ہی احمق تھا جو اتنی رقم کثیر خرچ کرکے تجھ کو لایا اور دھوکہ میں آگیا۔ اس نے اس کے جواب میں بھی یہی کہہ دیا دریں چہ شک (اس میں کیا شک) خیر یہاں تو جواب برمحل ہوگیا گو اس نے قصد نہیں کیا تھا۔ اسی طرح ان مولوی صاحب کو بھی بس اتنا ہی یاد تھا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے حتی کہ

آپ نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو بھی اختلافی بتلایا۔ اگرچہ فی نفسہ یہ بھی صحیح تھا کیونکہ کفار کو توحید رسالت میں بھی اختلاف ہے لیکن مسلمان کے استفتاء کے جواب میں یہ کہا جاتا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے تو اس میں تو آئمہ مذاہب کا بھی اختلاف مراد ہوتا ہے۔ بس اب تو لوگوں میں ان مولوی صاحب کی خوب ہی قلعی کھلی کہ یہ کون جاہل ہے جو کلمہ شریف کو بھی اختلافی بتلاتا ہے۔ اسی کے مشابہ ایک اور حکایت مجھے یاد آئی۔ کان پور میں عبدالرحمن خان صاحب مالک مطبع نظامی کا ایک ملازم تھا وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ جب تم حج کو چلو تو مجھ کو بھی ساتھ لے چلنا، میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم کچھ عربی سیکھ لو تا کہ وہاں کی زبان سمجھ سکو، وہ بے چارہ عربی سیکھنے پر بھی راضی ہوگیا، میں نے اس کو اول یہ لفظ سکھایا، هات الحجر (ڈھیلے لا) اور یہ کہہ دیا کہ جب میں یہ لفظ کہا کروں تم اسی وقت استنجا کے واسطے مجھے ڈھیلا لا دیا کرو۔ وہ بیچارہ روز اس پر عمل کرتا۔ ایک دن مجھے استنجا کی ضرورت نہ تھی اس لیے میں نے ڈھیلا نہ مانگا تو آپ خود ہی کہتے ہیں مولوی صاحب هات الحجر میں نے کہا، سبحان اللہ بندر کے ہاتھ لگی ہلدی کی گرہ اس نے کہا میں ہی پنساری ہوں، اب آپ نے هات الحجر کیا سیکھا ہے کہ ہر جگہ اسی کا استعمال شروع کر دیا، امر کا صیغہ استفہام میں برت رہے ہیں۔

ایک لطیفہ

اسی طرح ایک مرتبہ جہاز میں بنگالی لوگ آکر اپنی زبان میں کچھ سوالات کرتے جس کو میں نہ سمجھتا اور ان کو یہ بھی نہ سمجھا سکتا کہ میں نہیں سمجھا۔ آخر میں نے ایک اردوداں بنگالی سے کہا کہ مجھے اتنا بنگلہ سکھا دو کہ جب کوئی ایسا بنگالی مجھ سے بنگلہ میں باتیں کرے تو میں اس سے یہ کہہ دوں کہ میں بنگلہ نہیں سمجھتا۔ انہوں نے کہا کہ تم یوں کہہ دیا کرو بنگالی بوزی نا یعنی بوجھی نا (اور سننے میں بوزینہ آتا ہے جس کے معنی فارسی کے اعتبار سے بہت برے ہیں) تو مجھے ایک مشغلہ ہاتھ آگیا میں بنگالیوں سے یہی کہہ دیا کرتا، بنگالی بوزینہ اور اس میں میری نفس کی شرارت بھی مضمر ہوتی تھی مگر ایک بنگالی نے مجھے خوب ہی جواب دیا، جب میں نے اس سے کہا بنگالی بوزینہ تو اس نے بیساختہ

جواب دیا ہندوستانی بوزینہ یعنی میں اردو نہیں سمجھتا۔ الغرض جدال بالحق کو مشاکلتہ جدال کہہ دیا گیا ہے۔ مجھے مشاکلت پر ایک اور مسئلہ یاد آ گیا وہ یہ کہ انبیاء واولیاء پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہے حقیقت مصیبت نہیں۔

انبیاء واولیاء مصیبت سے پریشان نہیں ہوتے

کیونکہ مصیبت کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَآ اَصَبَكُمْ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے ہے اس پر اشکال ہوتا ہے کہ انبیاء واولیاء پر بھی تو مصیبت آئی ہے تو کیا ان پر بھی گناہوں کے سبب آئی ہے۔ اس کا ایک جواب تو تسلیمی ہے کہ ہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق خطا سے کون خالی ہے لیکن یہ جواب اولیاء کے بارے میں تو صحیح ہے، انبیاء کے بارے میں بے تکلف جاری نہیں ہوسکتا کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے جو کچھ خطا ہوتی ہے وہ اجتہادی خطا ہے جس پر ان کو ثواب ملتا ہے۔ تعمد معصیت (۱) کی ان میں ہرگز گنجائش نہیں اس لیے وہاں یہ کہنا کہ مصائب کا سبب ان کی خطائیں ہیں بہت بعید ہے بلکہ ان کے مصائب کا سبب محض رفع درجات ہے تو مَآ اَصَبَكُمْ (تم پر جو مصیبت ہے) کا خطاب صرف عصاۃ کو ہوگا چنانچہ مَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کا نتیجہ ہے) اس کا قرینہ ہے اس لیے دوسرا جواب سب سے لطیف یہ ہے کہ یہ بالکل سچ ہے کہ مصیبت گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مصیبت کہتے کس کو ہیں۔ مصیبت وہ ہے جس سے پریشانی اور انقباض لاحق ہو اور انبیاء واولیاء بیماری وغیرہ سے پریشان اور منقبض نہیں ہوتے تو یہ بیماری اور فاقہ اور تنگدستی وغیرہ ان کے حق میں مصیبت ہی نہیں بلکہ راحت ہے جیسے کوئی معشوق پیچھے سے آ کر اپنے عاشق کو بغل میں دبا لے اول اول تو اس کو کلفت معلوم ہوگی لیکن جب یہ معلوم ہوجائے گا کہ دبانے والا محبوب ہے اس وقت ساری کلفت دور ہوجائے گی اور چاہے گا کہ تھوڑی دیر اور دبائے رہے۔

(۱) جان بوجھ کر گناہ کرنے کی۔

زاہد صحابیؓ کی حکایت

حدیث میں زاہد صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ وارد ہے۔ یہ دیہات کے رہنے والے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دیہات کی چیزیں لایا کرتے تھے اور آپ ان کو شہر کی چیزیں عطا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مذکور ہے ''زاھر بادیتنا ونحن حاضرۃ'' (زاہر دیہاتی ہے اور ہم شہری ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ یہ بازار میں جارہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے سے تشریف لاکر ان کو دبالیا۔ اول تو زاہر بڑے گھبرائے کہ یہ کون ہیں، جب معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو حدیث میں آتا ہے کہ پھر تو زاہر اپنی کمر کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے سے خوب لگانے لگے تاکہ جسد اطہر سے مس ہوکر برکت حاصل ہوجائے، پھر آپ نے فرمایا کہ کوئی اس غلام کو خریدتا ہے وہ کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ مجھے فروخت کریں گے تو مجھے کھوٹا پائیں گے میرا کوئی بھی گاہک نہ ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لیکن تم خدا کے نزدیک کھوٹے نہیں ہو تو کیا کوئی ایسا کہہ سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دبالینے سے حضرت زاہر کو کچھ کلفت ہوئی تھی ہرگز نہیں، اس میں جو کچھ ان کو لطف آیا ہوگا انہی کے دل سے پوچھنا چاہیے (پھر غلام کے لفظ سے یاد کرنے میں جو مسرت حضرت زاہر کو حاصل ہوئی اس کو ان کے سوا کو بتلاسکتا ہے) کسی نے خوب کہا ہے:

بس کہا مجھ کو اے میرے غلام   سب سے پیارا نام ہے میرا یہی

اسی طرح انبیاء واولیاء پر جب کلفت آتی ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ نازل کرنے والا کون ہے۔ یوں کہتے ہیں:

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من(۱)

بلکہ بعض دفعہ جو اس کلفت کے انوار وآثار کو دیکھتا ہے تو عراقی کی طرح زبان حال سے کہتا ہے:

(۱) ''تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے''

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاکت تیغت سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۱)

حضرت رابعہ بصریہ رحمہا اللہ کا مذاق

پھر اس کو بیماری اور تنگدستی سے محبت ہوجاتی ہے اس کو دور ہونا پسند نہیں ہوتا۔ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا پر جب فاقہ اور مرض نہ ہوتا تو یہ بے قرار ہوکر فرماتیں کہ شاید محبوب ناراض ہیں جو بہت دنوں سے پیام وسلام نہیں آیا۔ یعنی فاقہ اور بیماری یہ ان کے نزدیک محبوب کا پیام وسلام تھا۔ پھر ان لوگوں کی بیماری اور فاقہ مستی کو مصیبت کون کہہ سکتا ہے ہاں یوں کہئے کہ صورت مصیبت ہے جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر لوگ مٹھائی کی چیزیں بنایا کرتے ہیں کبھی مٹائی کا درخت بناتے ہیں کبھی پھول پتے وغیرہ تو عوام کی مصیبت کو اور خواص کی مصیبت کو یوں سمجھئے جیسے ایک تو نیم کا اصلی پتہ ہو دوسرا اسی کی شکل میں مٹھائی کا بنا ہوا پتہ ہو صورت دونوں کی یکساں ہے مگر حقیقت میں آسمان وزمین کا فرق ہے کہ ایک تلخ ہے ایک شیریں ہے اسی لیے حضرت رابعہ فاقہ ومرض کے نہ آنے سے بے چین ہوجایا کرتی تھیں، آخر ان کو کچھ تو مزہ اس میں آتا ہوگا لیکن یہ ایک مذاق ہے اور دوسرا مذاق اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ ہر حال میں خوش ہو۔ نہ صحت سے بے چین ہو نہ مرض سے نہ فاقہ کے آنے سے گھبرائے نہ جانے سے اس سے بھی راضی ہو اس سے بھی راضی ہو بس اس کا حال اس کا مصداق ہو۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو (۲)

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

اور یہ حالت اس لیے افضل ہے کہ اس میں اپنے اختیار وارادہ کا فناء کلی ہے کہ اپنے لیے کسی حالت کو تجویز نہیں کرتا اگر حق تعالیٰ تندرست رکھیں مال ودولت عطا فرمادیں، اس سے بھی راضی ہے اگر بیمار رکھیں فاقہ بھیجیں اس سے بھی خوش ہے، خوشی اور

(۱) ''دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں'' (۲) '' آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیں تو زہے قسمت جب جان آپ کی عاشق ہوگئی تو پھر آپ جو چاہیں کریں''

غم کلفت (۱) وراحت مدح ومذمت (۲) دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں اور یہی کمال عبدیت ہے۔ لوگ اہل اللہ کی تکالیف کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ بھی ان کی طرح پریشان ہوں گے مگر جس کو یہ دولت حاصل ہو جس کا مذاق عبدیت اور فنا ہو چکا ہو بھلا وہ بھی کہیں تکلیف سے پریشان ہوا کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ روتے بھی ہوں آہ بھی کرتے ہوں بیماری میں تڑپتے بھی ہوں مگر اس تڑپنے سے ان کا دل پریشان نہیں ہوتا دل کو اس وقت ایک خاص سرور ولذت حاصل ہوتی ہے۔ باطن میں وہ پوری راحت میں ہوتے ہیں۔

دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم درکشند (۳)

آخر آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عشاق نے محبوبوں کے ہاتھ سے قتل ہونا بخوشی گوارا کیا ہے تو کیا قتل کے بعد ان کی لاش تڑپی بھی نہ تھی۔ تڑپی ضرور تھی لیکن اس کو خلاف محبت وعشق کوئی نہیں سمجھتا۔ اسی طرح اگر اہل اللہ سے ظاہر میں کلفت کی وجہ سے آہ ونالہ اور اضطراب صادر ہو (۴) تو یہ محبت کے خلاف نہیں کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے کہ کلفت کا احساس ہو ہاں ان کا دل مسرور ہوتا ہے جس پر واقعات بکثرت شاہد ہیں ایک بزرگ کے بدن پر کیڑے پڑے ہوئے تھے وہ بے چارے راستہ میں سڑک کے کنارے آپڑے تھے۔ ان پر ایک دوسرے بزرگ کا گزر ہوا ان کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا۔ دیکھا کہ زخموں پر ہزاروں مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں ان بزرگ نے ترس کھا کر ان کا سر اٹھا کر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور پنکھا جھلنے لگے۔ اس شخص نے معاً آنکھیں کھول دیں اور کہا جاؤ یہ کون ہے جو میرے اور محبوب کے درمیان آکر حائل ہو گیا تم میرے حال پر کیا ترس کھاتے ہو مجھے تمہارے حال پر رحم آتا ہے۔ یہ حکایت تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ایک واقعہ میرے بچپن کے زمانہ کا ہے میرے ایک عزیز جو درویش تھے کمبل اوڑھے ہوئے اپنے ایک عزیز سے ملنے آئے وہ دوسرے صاحب شال اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ شال اوڑھنے والے ان درویش سے کہنے لگے کہ تم نے کیا ڈھونگ بنایا ہے کہ لباس چھوڑ کر کمبل لادلیا یہ کمبل تو زہر لگتا ہے تو وہ درویش بے ساختہ کہنے لگے کہ مجھے تمہارا یہ شال

(۱) پریشانی (۲) تعریف اور برائی (۳) ''ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں'' (۴) رونا دھونا اور بے چینی ظاہر ہو

زہر لگتا ہے میں کیا کروں۔ الغرض آپ کو ان کی کلفت پر رحم آتا ہے اور ان کو آپ کی تندرستی وناز ونعم پر رحم آتا ہے کہ یہ لوگ آخرت میں درجات سے اور دنیا میں محبوب کی چھیڑ چھاڑ سے محروم ہیں۔

حکایت حضرت شبلی

حضرت شبلی جب کسی امیر کو دنیا میں منہمک دیکھتے تو یہ دعا پڑھتے ہیں:

الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک به وفضلنی علی کثیر ممن خلق تفضیلا(۱)

حدیث شریف میں یہ دعا بیمار کو دیکھ کر پڑھنے کے لیے وارد ہوئی ہے کہ جب کسی مریض ومبتلا کو دیکھو تو یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

ان شاء اللہ تم اس مرض وبلا سے محفوظ رہو گے۔ مگر فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ یہ دعا آہستہ سے پڑھے مریض کو سنا کر نہ پڑھے تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو تو حضرت شیخ زیادہ دنیا کو بھی بلا سمجھتے تھے اور اس سے محفوظ رہنے پر شکر کرنے کے لیے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات فقر سے کس درجہ راضی ہوں گے۔

حضرت غوث اعظم کو بادشاہ سنجر نے لکھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کے لیے ملک نیمروز کا کوئی حصہ وقف کردوں تا کہ ذاکرین وشاغلین کے خرچ کو کافی ہوجایا کرے۔ آپ نے اس کے جواب میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد دردل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیمروز بیک جونمی خرم(۲)

آخر کوئی بات تو ان کو نصیب ہے جو دنیا کی لذتوں سے اس قدر سیر ہوگئے۔ صاحبو! ان کے دل میں ایک دولت ہے جس نے ان کو سب دولتوں سے بے نیاز کردیا وہ کیا ہے وہ یہ دولت ہے جس کو عارف شیرازی نے بیان فرمایا ہے:

---

(۱) ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھ کو عافیت دی اس چیز سے جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور اپنی مخلوق سے بہتوں پر فضیلت دی'' سنن ابن ماجۃ: ۳۸۹۲، الدر المنثور ۱/ ۱۵۴ (۲) ''چتر سنجری کی طرح میرا بخت سیاہ رو ہوا کہ میرے دل میں سنجر کے ملک ہوس بھی ہو جب سے مجھے آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے میں نہیں خریدتا''

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے
بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز وہائے وہوئے(۱)

واللہ ایک بار فراغت قلب کے ساتھ محبوب کی طرف نظر کرنا سلطنت ہفت اقلیم سے افضل ہے۔

یک دم بہ خدا بودن کا مفہوم

خاقانی کہتے ہیں:

پس ازسی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمان(۲)

اس میں سلیمان علیہ السلام کی توہین کا شبہ نہ کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہوگا کہ یک دم باخدا ہونا ملک سلیمانی سے افضل ہے تو معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت ان کے لیے مفضول حالت تھی جواب یہ ہے کہ مطلب شعر کا یہ ہے کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملک سلیمانی کہ بکسے غیر سلیمان علیہ السلام دادہ شود (ایک دم خدا کے ساتھ مشغول ہونا اس ملک سلیمانی سے بہتر ہے جو سلیمان علیہ السلام کے علاوہ کسی اور شخص کو دے دیا جائے) باقی سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا بودن کے خلاف نہ تھا بلکہ وہ تو اس سلطنت میں بھی ہردم باخدا تھے ان کی سلطنت بھی ذکر میں داخل تھی کیونکہ ذکر کی ایک نوع یہ بھی ہے، لنگوٹہ باندھنے ہی کا نام بزرگی نہیں کاملین کو دنیا خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کیا کرتی یہ حالت ناقصین کی ہوا کرتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا سلطنت کی عجیب تفسیر

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سلطنت کی دعا کی ہے تو ساتھ میں یہ بھی فرمادیا: رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ(۳)

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہراً اس سے حرص وحسد کا شبہ ہوتا

(۱) ''فراغ دل سے کچھ وقت محبوب کے چہرہ پر نظر کرنا تمام دن ہو وہائے کی چتر شاہی سے بہتر ہے''
(۲) ''تیس سال کے بعد خاقانی کو یہ حقیقت محقق ہوئی کہ ایک دم خدا تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہونا ملک سلیمانی سے بہتر ہے'' (۳) ''یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کے لیے ملنا مناسب نہ ہو''۔

ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انہوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ من بعدی میں بعدیت زمانیہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبیہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لیے خواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لیے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر وتکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہوسکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے من معی بلکہ من قبلی (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت ورسالت میں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں، ختم ہوئی تفسیر مولانا کی۔ واقعی تفسیر کو ان حضرات سے سیکھے الغرض سلیمان علیہ السلام کا ملک ان کے حق میں باخدا ہونے کے خلاف نہ تھا وہ سلطنت کے ساتھ بھی ہر دم باخدا تھے اور حضرت سلیمان کو تو ملک کیا مضر ہوتا جبکہ حضرات صحابہ کو مضر نہ ہوا۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس دنیا ایسی تھی جیسے منتر جاننے والے کے ہاتھ میں سانپ جس طرح منتر جاننے والے پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوتا اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم پر دنیا کا اثر نہ ہوتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کے ہاتھ میں دنیا تھی، دل میں دنیا نہ تھی، دل میں خدا کی محبت ومعرفت اس درجہ بھری ہوئی تھی کہ وہاں دنیا ومافیہا کا گذر ہی نہ تھا۔ مولانا نے عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔

آب در کشتی ہلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است(۱)

حضرات صحابہؓ اور بعض اولیاء امت کی شان

اور حضرات صحابہؓ کی بھی بڑی شان ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے بعد انہی کا درجہ ہے۔ صاحبو! اولیاء امت میں بھی ایسے بکثرت ہوئے ہیں جن کو سلطنت وملک نے ایک ساعت کے لیے بھی باخدا ہونے سے نہیں روکا۔

مولانا جامی اور حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی حکایت

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار بہت بڑے بزرگ تھے اور اسی کے ساتھ آپ

(۱) "پانی اگر کشتی میں بھر جائے تو کشتی کی بربادی ہے اور اگر کشتی کے نیچے (باہر) رہے تو اس کی رفتار میں معین ہے"

کے یہاں شاہانہ ٹھاٹھ بھی تھا۔ مولانا جامی زمانہ طلب میں حضرت خواجہ صاحب کی بزرگی کا حال سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھا تو وہاں پورا شاہانہ سامان تھا، مولانا جامی کو خطرہ ہوا کہ یہ شخص ولی اور عارف کیا ہوگا جس کے یہاں اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے۔ ولی کو تو فقیر ہونا چاہیے اس خطرہ کو قوت ہوئی تو آپ نے برملا خواجہ صاحب کے منہ پر کہہ دیا:

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد(۱)

اور یہ کہہ کر وہاں ٹھہرے بھی نہیں آکر مسجد میں لیٹ رہے۔ یہاں انکی آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھتے ہیں کہ میدان حشر قائم ہے اور ایک شخص مولانا جامی کے سر ہو رہا ہے کہ میرا آپ کے ذمہ فلاں حق ہے وہ ادا کیجئے آپ کہتے ہیں کہ بھائی میرے پاس تو کچھ نہیں اس نے کہا کہ پھر میں آپ کی نیکیاں لوں گا، یہ بڑے پریشان تھے کہ اتنے میں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کی سواری سامنے سے گزری اور انہوں نے مولانا جامی کو اس حال میں دیکھ کر اپنی سواری روک لی اور فرمایا کیا قصہ ہے حق دار نے اپنا مطالبہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ یہ شخص میرا مہمان ہے اس کو تنگ نہ کرو اور جو کچھ لینا ہو ہمارے خزانہ سے جو ہمارا یہاں جمع ہے جا کر لے لو، ہیبت سے آنکھ کھل گئی تو دیکھا خواجہ صاحب نماز کے لیے سواری پر آرہے ہیں۔ مولانا جامی کے دل پر خواجہ صاحب کا رعب اور ان کی ہیبت جم گئی اور یہ سمجھے کہ واقعی یہ شخص خالی نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑا ہی صاحب ظرف ہے جس کو دنیا خدا سے غافل نہیں کرسکتی۔ مولانا جامی بے ساختہ دوڑ کر قدموں میں جا گرے اور قصور کی معافی چاہنے لگے۔ انہوں نے ہنس کر فرمایا کہ میاں خواب وخیال پر اعتماد نہیں کیا کرتے اب تو ان کو اور بھی اعتقاد بڑھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ خواب بھی آپ ہی کا تصرف تھا اور اگر تصرف نہ تھا تو آپ کا کشف ہی بہت صحیح ہے۔ بہرحال کھلی کرامت ظاہر ہوئی۔ مولانا جامی نے معافی چاہنے کے بعد سلسلہ میں داخل ہونے کی درخواست کی، خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا ہم کو اپنا وہ مصرعہ دوبارہ سنانا جو تم نے آتے ہی پڑھا تھا۔ مولانا جامی نے عرض کیا کہ حضور وہ تو میری

(۱) ''جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے''

جہالت تھی اب میری کیا مجال ہے جو ایسی بات زبان سے کبھی نکالوں۔ فرمایا ایک بار تم نے اپنی خواہش سے پڑھا تھا ایک بار ہماری خاطر سے پڑھ دو اور یہ بے ادبی نہیں کیونکہ اب تو ہم خود اصرار کر رہے ہیں ''ثم الامر فوق الادب'' تعمیل امر (ادب سے بڑھ کر ہے) کا لحاظ کر کے پڑھ دو۔ غرض انہوں نے مجبور ہو کر پڑھا:

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد(۱)

حضرت خواجہ احرار نے بے ساختہ دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا:

اگر دارد برائے دوست دارد(۲)

کاملین کے پاس دنیا کی حقیقت

سبحان اللہ کیا عجیب جواب ہے جس میں کاملین کے پاس دنیا ہونے کی حقیقت کھول دی کہ وہ جو کچھ رکھتے ہیں دوست یعنی محبوب حقیقی کے لیے رکھتے ہیں اپنے نفس کے لیے یہ ساز و سامان نہیں رکھتے۔ یعنی مقصود بالذات نفس کی راحت نہیں ہوتی بلکہ ہر حال میں رضا کا قصد ہوتا ہے گو اس کے ساتھ راحت نفس بھی لازم آجائے اور حقیقت میں یہ بڑا کمال ہے کہ متاع دنیا میں مشغول ہو کر انسان کا دل خدا سے غافل نہ ہو۔ الغرض کاملین کی نظر میں راحت و کلفت(۳) خوشی اور غم سب یکساں ہوتے ہیں کوئی حالت ان کو خدا تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی۔ پس ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ صورت مصیبت ہوتی ہے، حقیقت مصیبت نہیں ہوتی۔ گویا اس کو مشاکلۃ(۴) مصیبت کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح یہاں جدال بالحق کو مشاکلۃ(۵) جدال کہہ دیا گیا کہ صورت ہر جدال کی ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ بات بھی پہلے ہی زمانہ کے ساتھ خاص تھی کہ جدال بالباطل کی صورت جدال بالحق کے مشابہ تھی کہ جس طرح اہل حق تہذیب کے ساتھ مناظرہ کرتے تھے اہل باطل بھی تہذیب کی رعایت کرتے تھے۔ باقی آج کل تو جدال بالباطل کا پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ آج کل مناظرہ میں خصم پر پھبتیاں اڑانا خلاف

(۱) ''جو شخص دنیا کو دوست رکھے وہ مرد خدا نہیں ہے'' (۲) ''اگر دوست رکھے تو محبوب حقیقی کے لیے دوست رکھے'' (۳) پریشانی (۴) شکلاً مصیبت کہہ سکتے ہیں (۵) حق کے لیے لڑنے کو شکلاً جدال کہہ دیا

تہذیب باتیں استعمال کرنا خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنا ہر شخص کو معلوم ہوجاتی ہے جس سے سب سمجھ جاتے ہیں کہ اظہار حق مقصود نہیں محض ہار اور جیت مقصود ہے آج کل تو دنیا میں شاید ہی کہیں جدال بالحق ہوتا ہو ورنہ عموماً جدال بالبال ہی ہوتا ہے اور گو یہ حالت بہت زمانہ سے ہے مگر اس زمانہ میں پہلے سے زیادہ ترقی ہے۔

حضرت امام اعظم کی اپنے صاحبزاہ کو نصیحت

امام ابوحنیفہ نے اپنے صاحبزادے حماد کو نصیحت فرمائی تھی کہ علم کلام ومناظرہ میں مشغول نہ ہونا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کو خود مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ فرمایا ہاں ہم نے مناظرہ کیا ہے لیکن ہماری یہ حالت تھی کہ ہم یہ تمنا کرتے تھے کہ حق بات خصم (۱) کے منہ سے نکلے اور ہم اس کو قبول کریں اور تم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ خصم کے منہ سے سوائے باطل کے کچھ نہ نکلے تاکہ تم غالب رہو ہم کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ ہمارا مسلمان بھائی اپنی زبان سے غلط بات کہے۔ پھر اس کی پچ کرے یا ہم حق بات کہیں اور اس کو ہار کر ہماری بات ماننا پڑے جس سے ہمارا غلبہ اور اس کا عجز ظاہر ہو یا ضد میں آکر وہ ہماری حق بات کو رد کرنے لگے تو اس کے ایمان کا ضرر ہو اس لیے ہم یہ تمنا کیا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے تو ہم اس کو جلدی سے قبول کرلیں جس سے اس کی عزت بھی ہو اور حق بھی واضح ہوجائے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کے بعد کا زمانہ بھی غنیمت تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ جو یہ تمنا کرتے تھے کہ خصم کے منہ سے باطل کے سوا کچھ نہ نکلے اور حق بات ہمارے ہی منہ سے نکلے تو اس تمنا کا منشا یہ تھا کہ وہ لوگ اس بات کا قصد کرتے تھے کہ اگر کبھی خصم کے منہ سے حق بات نکل گئی تو ہم ضرور مان لیں گے ورنہ اگر ان کی نیت یہ نہ ہوتی تو اس تمنا کی ان کو کیا ضرورت تھی کہ خصم کے منہ سے باطل ہی نکلے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ غلط بات ہی کا رد کرنا چاہتے تھے حق بات کے رد کرنے کا وہ قصد نہیں کرتے تھے مگر آج کل تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ خصم کے منہ سے حق بات نکلے نہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ باطل نکلے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے یہ بات دل میں

(۱) فریق مخالف۔

ٹھان لیتے ہیں کہ خصم کے منہ سے جو کچھ نکلے گا اس کو رد ہی کریں گے خواہ حق ہو یا باطل ہو۔ افسوس تو یہ ایک تیسرا درجہ ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھا یہ آج پیدا ہوا ہے کہ مناظرہ میں ہر شخص یہ ٹھان لیتا ہے کہ دوسرے کے منہ سے جو کچھ نکلے اس کو رد ہی کرنا چاہیے اگرچہ وہ حق بات ہی ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

آدمیت روح انسانی پر موقوف ہے

کانپور میں ایک مرتبہ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا، ایک طالب علم بولے کہ نہیں یہ مسئلہ اس طرح ہے۔ میں نے کہا کہ تم نے اس طرح کہاں دیکھا کہنے لگے ہدایہ میں لکھا ہے۔ میں نے ہدایہ ان کے سامنے رکھ دی کہ لو اس میں نکالو اس میں ہر چند تلاش کیا مگر وہ مسئلہ نہ تھا تو اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کریں کہتے ہیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ہدایہ ہے میں نے کہا سبحان اللہ پھر اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں اور میرا یہ سوال پھر بھی موقع کا تھا کیونکہ آدمیت اس صورت کا نام نہیں بلکہ آدمیت نفس ناطقہ اور روح انسانی پر موقوف ہے جو ایک مخفی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گر بصورت آدمی انسان بدے احمد و بوجہل ہم یکساں بدے(۱)

بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی صورت آدمی کی ہے لیکن روح درندوں اور جانوروں کی، سباع اور بہائم (۲) کی ہے۔ ایسوں ہی کی نسبت ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (یہ لوگ مثل جانوروں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں)

مولانا فرماتے ہیں:

اینکہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند(۳)

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نباید داد دست(۴)

(۱) ''اگر صورت کی وجہ سے آدمی انسان ہوتا تو احمد اور ابوجہل برابر ہوتے'' (۲) روح درندوں اور جانوروں کی ہے (۳) ''یہ جو آدمیوں کا اختلاف دیکھتے ہو یہ آدم نہیں یہ آدم کے غلاف میں ہیں'' (۴) ''بہت سے آدمیوں کی شکل میں شیطان ہیں اس لیے ہر کس وناکس کا اندھا ہو کر مرید نہ ہونا چاہیے''۔

حقیقی اور نقلی انسان کا فرق

غلاف آدم پر مجھے یاد آیا کہ حیدر آباد میں محرم کے زمانہ میں بعض لوگ شیر اور ریچھ بنتے ہیں یعنی شیر اور ریچھ کی کھال پہن کر لوگوں کو ڈراتے ہیں تو کیا اس سے وہ سچ مچ شیر ہوگئے ہرگز نہیں بلکہ ان کو غلاف شیر کہا جائے گا۔ اسی طرح آدمی کی کھال بدن پر لگ جانے سے کسی کو آدمی نہیں کہا جاسکتا، آدمیت کچھ اور ہی چیز ہے، دیکھئے اصلی شیر میں اور غلاف شیر میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہ نقلی شیر تو کتے سے بھی سب سے پہلے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور حقیقی شیر کی یہ شان ہوتی ہے۔

گر جہاں پر برف گردسر بسر تاب خور بگداز دش از یک نظر(۱)

واقعی اگر جنگل میں ایک شیر آکر دھڑوکے تو سارا جنگل کانپ جائے اور یہ نقلی شیر اس کی آواز ہی سن کر بھاگ دے۔ یہی فرق ہے حقیقی انسان اور نقلی انسان میں دیکھئے ابوجہل بھی کعبہ میں جاتا تھا جبکہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے وہ تو جاکر سب بتوں کو سجدہ کرتا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بار کعبہ میں داخل ہوئے تھے تو سارے بت سرنگوں ہوکر آپ کے قدموں میں آگرے، ایک وہ انسان تھا ایک آپ انسان تھے۔ پس حقیقت میں ابوجہل آدمی نہ تھا بلکہ غلاف آدم تھا۔ اسی لیے میرا ان طالب علموں سے یہ سوال ایک حد تک صحیح تھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ آدمی ہیں ممکن ہے کہ آپ غلاف آدم ہوں۔ باقی ان کا سوال محض ہٹ دھرمی تھا کیونکہ ہدایہ کا ہدایہ ہونا تطابق عبارت سے معلوم ہوسکتا تھا، وہ اپنی ہدایہ لاکر اس ہدایہ کا مقابلہ کرسکتے تھے مگر صاحب ملا آن باشد کہ چپ نشود (ملا وہ ہے کہ چپ نہ ہو) ممکن ہے کہ تطابق عبارت کی صورت میں بھی وہ یہی کہتے کہ یہ ہدایہ نہیں کیونکہ وہ دونوں کی عبارت میں بھی اعتبار سے فرق نکال سکتے تھے کہ نقوش اس حیثیت سے کہ میری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش ہیں اور اس حیثیت سے کہ دوسری کتاب میں ہیں ہدایہ کے نقوش نہیں ہیں کچھ اور ہوں گے۔

(۱) ''اگر تمام عالم بھی برف سے پر ہوجائے آفتاب کی تابش اس کو ایک نظر سے پگھلا دیتی ہے''

اعتبار کا فرق

جیسا کہ ایک طالب علم نے اپنے بھائی کو گالی دی تھی ماں کی، کسی نے کہا ظالم وہ تیری بھی تو ماں ہے تو آپ نے کہا صاحب اعتبار کا فرق ہے اس حیثیت سے کہ وہ میری ماں ہے محذومہ مکرمہ ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کی ماں ہے ایسی ویسی ہے تو بھائی یہ اعتبار کا فرق بڑے غضب کا ہے جس کی بابت مشہور: ''لولا الاعتبارات لبطلت الحکمة'' (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حکمت باطل ہوجاتی) لیکن اگر وہ اعتبارات ایسے ہی اعتبارات ہیں تو یوں کہنا چاہیے ''لولا الاعتبارات لبطلت الحماقة'' (اگر اعتبارات نہ ہوتے تو حماقت باطل ہوجاتی) غرض ان طالب علم کے اس جواب سے سب کو معلوم ہوگیا کہ ان کو محض ضد اور اپنی بات کی پچ منظور ہے آج کل عموماً یہ حالت ہے کہ محض ایک دوسرے کی ضد میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً دو عالموں میں مخالفت ہے تو اب وہ مخالفت دنیوی معاملات سے گزر کر مسائل شرعیہ تک پہنچتی ہے کہ جس مسئلہ میں ایک کا فتویٰ جواز کا ہوگا دوسرا اس کی ضد میں عدم جواز کا فتویٰ دے گا، بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس ضد کا

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا اپنا مذہب چھوڑ کر یہ ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا

شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہنے والے علماء کی حکایت

یہیں دہلی کا قصہ ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں علماء کی دو جماعتیں تھیں۔ ایک جماعت شیخ سدو کے بکرے کو حلال کہتی تھی اور ایک جماعت حرام بتلاتی تھی۔ ایک مرتبہ دونوں جماعت کے لوگوں کو ایک شخص نے دعوت میں جمع کرلیا۔ جب سب کے سامنے کھانا رکھ دیا گیا اور وہ کھانے کو تیار ہوئے تو اس نے کہا کہ ذرا تھوڑی دیر سب حضرات توقف فرمائیں، مجھے کچھ کہنا ہے، سب نے ہاتھ روک لیا تو اس نے کہا کہ یہ جو گوشت آپ کے سامنے رکھا ہوا ہے شیخ سدو کے بکرے کا ہے اب جس کا جی چاہے کھائے، جس کا جی چاہے نہ کھائے۔ پس جو لوگ اس کو حرام سمجھتے تھے انہوں نے تو ہاتھ کھینچ ہی لیا، تماشہ یہ کہ جو لوگ اس کو حلال کہتے تھے انہوں نے بھی ہاتھ روک لیا، داعی نے ان سے

کہا کہ صاحب یہ حضرات اگر ہاتھ روکیں تو ان کو حق ہے کیونکہ یہ اس کو حرام سمجھتے ہیں مگر آپ نے ہاتھ کیوں روکا آپ کے نزدیک تو یہ حلال ہے۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ بھائی حق بات تو یہی ہے کہ یہ حرام ہے مگر ہم تو محض ان کی ضد میں اس کو حلال کہتے ہیں۔ سود یکھئے یہ ضد ایسی بری بلا ہے کہ اس میں انسان کیا کچھ کر گزرتا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ وہ لوگ آج کل کے اختلاف کرنے والوں سے پھر بہت غنیمت تھے کہ انہوں نے حرام کو صرف زبان ہی سے حلال کیا، پیٹ کے اندر اس کو داخل نہیں کیا۔ گویا انہوں نے زبان سے نکالا، اندر داخل نہیں کیا۔ نیز موقع پر اپنی غلطی کا اقرار بھی کرلیا کہ ہم جو کچھ کہتے تھے محض ضد میں کہتے تھے۔ اور آجکل اگر کوئی مولوی کسی کی ضد میں حرام کو حلال کہتا ہو اور اس کو ایسا موقع پیش آجائے جیسا ان صاحبوں کو پیش آیا تھا تو آجکل کے ضدی مولوی کبھی اس کا اقرار نہ کریں گے کہ ہم محض ضد میں اس کو حلال کہتے تھے اور واقع میں حق یہی ہے کہ حرام ہے اور یقیناً سب کے سامنے اپنی بات کی لاج رکھنے کو طوعاً وکرھاً اس کو کھا بھی جائیں گے، گو دل نہ مانتا ہو، اندر سے جی متلاتا ہو، طبیعت اس کو پھینکنا چاہتی ہو مگر یہ اپنی بات کے پکے بری بھلی طرح اس کو ضرور نگل ہی جائیں گے۔ الغرض امام صاحب کے صاحبزادے کو صورت یکساں ہونے کی وجہ سے شبہ ہوگیا کیونکہ جدال بالحق وجدال بالباطل دونوں کی صورت یکساں ہی تھی اور جس طرح جدال کا اطلاق جدال بالحق پر کبھی ہوجاتا ہے اسی طرح مراء کا اطلاق بھی مراء بالحق کبھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے: ''فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا'' (سو آپ ان کے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجیے) اس میں مراء بالحق پر ہی مراد ہے کیونکہ مراء بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہوسکتی اور اس آیت میں مراء ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو اس کو صورۃ مراء کہہ دیا گیا بوجہ مشاکلۃ کے، ورنہ حقیقی مراء حرام ہے۔

تحصیل علم کی اصل غرض محض رضاء الٰہی ہے

حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: من تعلم العلم

ليماري به السفهاء الخ **مجھے حدیث کے الفاظ بعینہ کم یاد رہتے ہیں، اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے:**(قلت وفي الترغيب والترهيب المنذري ص ۲۹۔۳۰ ما نصه وروي عن كعب بن مالك قال سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول من طلب العلم ليجاري به العلماء أو ليماري به السفهاء ويصرف به وجوه الناس إليه أدخله الله النار. رواه الترمذي واللفظ له وابن أبي الدنيا في كتاب الصمت وغيره والحاكم شاهدا والبيهقي وقال الترمذي حديث غريب. وعن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه و سلم لا تعلموا العلم لتباهوا به العلماء ولا تماروا به السفهاء ولا تخيروا به المجالس فمن فعل ذلك فالنار والنار. رواه ابن ماجه وابن حبان في صحيحه والبيهقي كلهم من رواية يحيى بن أيوب الغافقي عن ابن جريح عن أبي الزبير عنه ويحيى هذا ثقة احتج به الشيخان وغيرهما ولا يلتفت إلى من شذ فيه الخ والله أعلم)

اہل علم اس کی تحقیق کرلیں مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے جھگڑا کرے اور لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔ تو دیکھیے مراء پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آج کل تحصیل علم سے زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہورہی ہے بلکہ آج کل تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی، نہ حسن نہ مذموم(۱) اب تک تو ہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیاریہ بدون تصور غایت وغرض کے موجود نہیں ہوسکتے، مگر آج کل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم کو شبہ ہوگیا، اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض محض رضائے الٰہی ہو، بلکہ اکثر کو تو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علم دین پڑھتے ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے، اگر رضائے الٰہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام ضرور ہوتا، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مراء

(۱) نہ اچھی نہ بری

جدال ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے۔ بس آج کل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کرلی، اس سے جھگڑ لیے، کچھ جاہل ان کی طرف ہوگئے پھر علاوہ ناموری کی اس صورت میں آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے، اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علماء محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خوامخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچنا چاہے تو اس کے پاس سے ٹلتے نہیں، اس کے سر ہوجاتے ہیں۔

ایک فضول بحث میں اضاعت وقت

چنانچہ لکھنؤ میں مفتی سعد اللہ صاحب و مولوی سراج الدین صاحب میں لفظ اختیر کی بابت اختلاف ہوا کہ فصیح اختیر (بکسر الہمزہ) ہے یا اختیر (بضم الہمزہ) ایک کسرہ فصیح کہتے تھے، ایک ضمہ کو مگر فیصلہ نہ ہوتا تھا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس اختلاف میں پڑنے سے تم کو کتنی رکعتوں کا ثواب ملا، ایک فضول بحث میں وقت ضائع کیا اور فریقین نے دوسرے علماء سے استفتاء کیے۔ مولوی سراج الدین صاحب نے جو کہ بہت ہی ذکی ہیں مفتی محمد یوسف صاحب کی خدمت میں بھی سوال بھیجا، انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ یہ کوئی دین کا مسئلہ نہیں جس کا جواب دیا جائے، فضول بحث ہے تو مولوی سراج احمد صاحب بولے کہ اس کو دین بنانا کیا مشکل ہے۔ آپ نے فورا ایک صورت اپنے ذہن سے گھڑی اور اس طرح استفتاء لکھا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ اگر آج صبح سے شام تک تُو نے کوئی لفظ غیر فصیح بولا تو تجھ پر تین طلاق۔ اس عورت نے لفظ اختیر بولا تو اس پر طلاق ہوئی یا نہیں؟ پھر یہ استفتاء مفتی صاحب کے پاس بھیجا گیا، وہ بیچارے یہ سوال دیکھ کر مجبور ہوگئے اور ان کو اپنی تحقیق لکھنی پڑی، یہ بھی اس لیے کہ شاید مفتی صاحب اس سوال سے پریشان ہوگئے ورنہ آزاد محقق اس کا بھی جواب دے سکتا تھا۔ وہ یہ کہتا کہ میں صاحب واقعہ کو جواب دوں گا تم کو جواب نہ دوں گا، یا یہ کہتا کہ جواب دینا فرضِ کفایہ ہے فرض عین نہیں، جاؤ میں تم کو جواب نہ دوں گا کسی اور سے پوچھو۔ مگر ایسے جواب کے لیے کسی

قدر ہمت کی ضرورت ہے کیونکہ ایسے جواب دینے والے کو لوگ جاہل اور بدمزاج کج اخلاق مشہور کریں گے، تو جس میں اتنی ہمت ہو کہ اگر کوئی اس کو جاہل وغیرہ کہہ دے تو برا نہ مانے، وہ شخص ایسا جواب دے سکتا ہے مگر ایسی ہمت والے کم ہیں۔

اعانت معصیت بھی گناہ ہے

خصوص آج کل تو یہ حالت ہے کہ علماء سوال کرنے والوں سے ڈرتے ہیں، ان کو بیہودہ سوال سے روک نہیں سکتے کہ اگر روکیں گے تو یہ ہم کو بدنام کریں گے یا مدرسہ کا چندہ بند کردیں گے اس لیے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ بعض لوگ طعنت (۱) کی راہ سے سوال کرتے ہیں، ان کا مقصود حق بات کا معلوم کرنا نہیں ہوتا بلکہ مجیب کو پریشان کرنا ہوتا ہے، ایسے شخص کو تو جواب دینا شاید جائز بھی نہ ہو کیونکہ ایسا سوال گناہ ہے اور مجیب اس کی اعانت فی السوال کررہا ہے کیونکہ اس کے جواب دینے سے سائل کو آئندہ کے لیے سوال کی جرأت بڑھتی ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ بھیک مانگنے والے جن کو بھیک مانگنا حرام ہو ان کو دینا بھی حرام ہے کیونکہ ان کو سوال کرنا ہی حرام ہے اور دینے سے سوال کی اعانت ہوتی ہے اور اعانت معصیت بھی داخل معصیت ہے، پس ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دینا چاہیئے کہ تم کو جواب معلوم ہی نہیں تو کہہ دو اچھا ہم تو جاہل ہیں پھر تم ہم سے کیوں سوال کرتے ہو، اور اگر کوئی یہ کہے کہ تم کو جواب معلوم ہے پھر کیوں نہیں بیان کردیتے اس سے کہہ دو کہ ہاں معلوم ہے مگر تجھ کو نہ بتلاویں گے۔

بامدعی مگوئید اسرار عشق ومستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی (۲)

غضب تو یہ ہے کہ آج کل ہر سوال کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے، گو جواب معلوم بھی نہ ہو تو گھڑ مڑھ کر جواب لکھتے ہیں محض اس لیے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں شخص کو اس سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اَستغفر اللہ العظیم

مفتی کو مسائل کا تابع نہ ہونا چاہیے

حالانکہ کسی بات کا جواب معلوم نہ ہونا کوئی عیب نہیں کیونکہ علم محیط تو حق تعالیٰ

(۱) عناد کی وجہ سے (۲) ''مدعی سے اسرار عشق ومستی کو بیان نہ کر واس کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو''

کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے عالم بلکہ امام اور مجتہد کو بھی کہیں نہ کہیں لا ادری کہنا پڑتا ہے، کسی امام کی (یعنی مالک رحمۃ اللہ علیہ) کی حکایت ہے کہ ان سے ایک مجلس میں چالیس سوالات کیے گئے تو انہوں نے صرف چار کا جواب دیا باقی سب کی نسبت یہی فرماتے رہے لا ادری لا ادری یعنی مجھے معلوم نہیں۔ پس نہ معلوم ہونے کی صورت میں خواہ مخواہ درپے جواب کے ہونا تو مذموم ہے ہی۔ میرے نزدیک تو اگر جواب معلوم بھی ہو تو متعنت کے سامنے بیان نہ کرے اس سے تو انکار ہی کردے اور یوں کہہ دے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست(۱)

الغرض جواب دینے والے کو سائل کا تابع نہ ہونا چاہیے بلکہ سائل کو اپنا تابع بنانا چاہیے اور اگر وہ تابع نہ رہے تو اس کو جواب ہی نہ دے۔ پس اگر یہ معلوم ہو کہ سائل منصف ہے اور طالب حق ہے اس کو ضرور جواب دے بلکہ اپنے کاموں کا حرج کر کے بھی اس کو جواب دینا چاہیے۔ اور اگر متعنت ہے اس کو ہرگز جواب نہ دے، ایسے شخص کو جواب دینے کی طبیعت بھی نہیں چاہتی اور منصف کو جواب دینے کے لیے طبیعت میں خود بخود تقاضا ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے حقیقت واضح کردی جائے۔

مسئلہ بتلانے میں مولانا عبدالقیوم کا معمول

مولانا عبدالقیوم صاحب کی عادت تھی کہ فضول سوال کا جواب نہیں دیا کرتے تھے اور محققین نے ہمیشہ اس کا لحاظ کیا ہے کہ وقت کو فضول ضائع نہ کیا جائے، اول تو ان کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی شخص کوئی مسئلہ ان سے پوچھتا تو اپنی طرف سے فتویٰ کبھی نہ دیتے تھے بلکہ کتاب کا نام لیکر فرمایا کہ درمختار یا ہدایہ وغیرہ میں یوں لکھا ہے۔ یہ تو آپ کی غایت احتیاط کا نمونہ ہے اگر کوئی شخص فقہی مسئلہ معلوم کرنے کے بعد یہ سوال کرتا کہ یہ مسئلہ کسی حدیث میں بھی ہے یا نہیں تو آپ فرمادیتے کہ میں نومسلم نہیں ہوں، خدا کا

(۱) مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ نہ معلوم ہو

شکر ہے کہ میرے آباؤ اجداد حضور ﷺ کے زمانہ سے مسلمان چلے آرہے ہیں۔ حضور ﷺ نے جو کچھ کیا اس کو ان حضرات نے یادرکھا جو اس زمانہ میں موجود تھے پھر جو کچھ ان کو کرتے ہوئے دیکھا اس پر ان کی اولاد نے عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ بسلسلہ دین مجھ تک پہنچا ہے اس لیے مجھے حدیث کی ضرورت نہیں، حدیث کی احتیاج صرف نو مسلم لوگوں کو ہے جن کے آباؤ اجداد نے اسلام لانے کے بعد حضور ﷺ کو نہیں دیکھا۔ ان کو حضور ﷺ کا عمل اپنے باپ دادوں کے ذریعے سے معلوم نہیں ہوا، اس لیے احادیث کے ذریعے سے معلوم کرنے کی ان کو ضرورت ہے۔ مولانا عبدالقیوم صاحب کے اس جواب کا منشا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ سائل کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ تیرا یہ سوال فضول ہے کیونکہ ہم نے تجھے اگر بتلا بھی دیا کہ فلاں حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے تو تجھ کو وجہ دلالت کیونکر معلوم ہوگی، اب اگر ہم وجہ دلالت بھی بیان کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سارے مقدمات اور مبادی تم کو اسی وقت پڑھا دیں، اور اگر وجہ دلالت میں تم ہماری تقلید کروگے کہ چونکہ مولوی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس مسئلہ پر دلالت کرتی ہے اس لیے مانتا ہوں تو پھر تم پہلے ہی سے ہماری تقلید کیوں نہیں کرتے کہ یہ مسئلہ شریعت میں اسی طرح ہے جس طرح مولوی صاحب نے بتلایا، ہاں جو شخص وجہ دلالت کو سمجھ سکتا ہو یعنی طالب علم ہو جو مقدمات اور علم مبادی سے واقف ہو چکا ہو، اس کو اس سوال کا حق ہے اس کے سامنے دلائل حدیثیہ بیان کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ باقی جاہلوں کے سامنے یہ علوم بیان کرنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔

مسائل کی تحقیق میں حضرت حاجی صاحب کا ارشاد

حضرت حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب تم کو کوئی تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہے تو سب رطب و یابس شبہات و جواب اس کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کرلو، مجھے انتخاب اور ترجیح کی فرصت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ

تھے، حجام سے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے، اس نے استرہ لیکر سارے بال مونڈھ کر اور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید سفید بال چھانٹ لیجیے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو، کیونکہ ایسے جواب سے مجیب کی وقعت نہیں ہوتی، لوگ اس کو جاہل یا بدمزاج مشہور کر دیتے ہیں، اسی لیے آج کل ایسے جواب بہت کم لوگ دیتے ہیں، اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہی ہوجاتے ہیں۔ سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔

حضرات اکابر دیوبند کی بے نفسی

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ایک معقولی صاحب (۱) آکر لپٹ گئے کہ میں آپ سے مناظرہ کروں گا، مولانا نے فرمایا کہ مناظرہ سے دو مقصود ہوتے ہیں، ایک اظہار حق یہ تو آج کل مفقود (۲) ہے، دوسرے بڑا بننا اور اپنی شان علم جتلانا۔ آج کل زیادہ تر یہی مقصود ہوتا ہے تو اس کے لیے آپ کو مناظرہ کی ضرورت نہیں، فضول کیوں مشقت میں پڑتے ہیں۔ بآواز بلند کہے دیتا ہوں کہ صاحبو! آپ مجھ سے زیادہ عالم ہیں میں جاہل ہوں مجھے کچھ نہیں آتا، بس آپ کا مقصود حاصل ہوگیا۔ چنانچہ مولانا نے بآواز بلند یہ مضمون فرمادیا اور وہ معقولی اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔ سبحان اللہ یہ حضرات کیسے بے نفس تھے، اپنے آپ کو بالکل مٹائے ہوئے تھے۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی عادت تھی کہ درس میں اگر کسی طالب علم نے آپ کی تقریر پر اعتراض کیا اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ مجھ سے تقریر میں غلطی ہوئی ہے تو فورا اپنی غلطی کا اعتراف فرمالیتے تھے، پھر ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بار بار فرماتے تھے کہ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی، یہاں تک کہ اعتراض کرنے والا شرما شرما جاتا تھا اور بعض دفعہ جب کسی مضمون میں پڑھاتے ہوئے شرح صدر نہ ہوتا تو صاف فرمادیتے کہ مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا، پھر اسی پر بس نہیں کرتے تھے بلکہ عین درس میں

(۱) علم عقلیات کے ماہر (۲) پایا نہیں جاتا۔

طلبہ کے سامنے کتاب اٹھا کر اپنے ماتحت مدرسین میں سے کسی کے پاس پہنچ جاتے اور بے تکلف فرمادیتے کہ مولانا مجھے اس مقام پر شرح صدر نہیں ہوا ذرا آپ اس کی تقریر فرمادیجیے، انہوں نے تقریر کردی تو پھر اپنے حلقہ درس میں انہی صاحب کا نام لیکر فرماتے کہ مولانا نے اس مقام کی یہ تقریر کی۔ حقیقت میں ایسا بے نفس ہونا بڑا مشکل ہے، آج کل لوگ اس کو ذلت سمجھتے ہیں مگر واللہ عزت وتواضع اسی میں ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰه(۱) آخر ان حضرات نے جو ایسی بے نفسی اختیار کر رکھی تھی کیا اس سے ان کی جاہ وعزت ہوگئی کہ آج ان کی یہ باتیں کمالات اور کرامات میں شمار ہورہی ہیں، لیکن طلبہ کے ساتھ یہ برتاؤ اسی وقت طے ہونا چاہیے جب کہ سوال صحیح ہو۔

حضرت شیخ الہند کی ظرافت

اور اگر بے ڈھنگا سوال ہو جس کے طرز سے یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا منشا محض اعتراض اور پریشان کرنا ہے تو اول اس کو حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ کی طرح الزامی جواب سے خاموش کرواتے۔ مولانا کو الزامی جواب میں بہت ملکہ تھا مگر وہ ایسوں ہی کے واسطے ہوتا تھا جن کا مقصود محض اعتراض ہوتا، اور جو لوگ تحقیق کے طالب معلوم ہوتے ان کے سامنے تحقیقی جوابات بھی خوب بیان فرماتے تھے۔ مولانا میں ظرافت بھی بہت تھی، جب طالب علم الزامی جواب سے ساکت ہوجاتا تو فرمادیا کرتے تھے کہ تالاب پاس ہے۔ (یعنی اس میں جا کر ڈوب مرو) اور اگر کوئی شخص اس سے بھی باز نہ آوے تو اس کو جواب ہی نہ دو۔

آنکس کہ بقرآن و خبر زور نرہی آنست جوابش کہ جوابش ندھی(۲)

اور اگر اس پر بھی متنبہ نہ ہو اور جواب کا تقاضا ہی کرتا رہے تو اس کو حلقہ درس سے نکال دو کیونکہ جس شخص کو اپنی بات کی پچ(۳) کرنے کا مرض ہو وہ ہرگز پڑھانے کے قابل نہیں

(۱) ''جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتے ہیں'' مجمع الزوائد ۸/ ۸۲، کنز العمال: ۵۷۳۰ (۲) جو شخص قرآن اور حدیث کے جواب کو تسلیم نہ کرے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو جواب نہ دو (۳) اپنی بات پر ضد کرنے کی عادت ہو۔

اگر اس کے اس مرض کا علاج نہ کیا گیا اور اسی طرح سر آنکھوں پر بٹھالیا گیا تو اس میں ہمیشہ کے لیے یہ عادت پختہ ہوجائے گی کہ جو بات اس کے منہ سے نکلے گی اس کی پچ کیا کرے گی وناحق کی ذرا پرواہ نہ کرے گا اور اس کا دین پر جو برا اثر پڑے گا وہ ظاہر ہے:

بد گہر را علم وفن آموختن دادن تیغ است دست راہزن(۱)

نا اہل کو علم دین پڑھانے کا انجام

کلکتہ میں ایک عالم نے مسئلہ رضاع(۲) غلط لکھا اور علماء کے پاس اس کو دستخط کے واسطے بھیجا، علماء نے بالاتفاق اس پر دستخط سے انکار کیا کہ یہ تو بالکل غلط مسئلہ ہے، کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا آخر میں ان کو اپنی غلطی کا علم بھی ہوگیا تھا مگر بات کی پچ بری بلا ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ لکھ مارا اور اس میں واہی تباہی دلائل سے اپنے مطلب کو ثابت کرنا چاہا پھر وہ اپنے استاد کے پاس اس فتویٰ کو لے گئے اور ان سے جاکر کہا کہ اس مسئلہ میں سب لوگ مجھ سے علیحدہ ہیں، کوئی میرے ساتھ نہیں، آپ ہی میرا ساتھ دیدیجیے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی یہ تو غلط مسئلہ ہے اس میں ساتھ کیونکر دوں۔ کہنے لگے کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ غلط ہے مگر اب تو زبان وقلم سے نکل گیا، اب تو جس طرح ہو میری تائید کردیجیے مگر استاد نے ساتھ نہیں دیا۔ افسوس دین کو کھیل بنا رکھا ہے کہ محض اس وجہ سے کہ ایک بات زبان سے نکل گئی ہے اس کی لکیر پیٹے جاتے ہیں حالانکہ اس کا غلط ہونا معلوم ہے، نہ معلوم ان لوگوں کے دلوں سے خوف خدا کہاں جاتا رہا۔ اب سنا ہے کہ ان عالم مفتی صاحب کا انتقال ہوگیا، خدا معاف کرے۔ اگرچہ جرم بہت سنگین ہے میں تمام مدرسین و مہتممین مدارس سے التجا کرتا ہوں کہ للہ اس بات کا کچھ انتظام کیجیے کہ سب طلبہ کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکا جائے اور سب کی تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ جس شخص کے اخلاق خراب ہوں اول اس کے اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کیا جائے، بات بات پر اس کو ٹوکا جائے، اگر اصلاح کی امید نہ ہوتو مدرسہ سے

(۱) نا اہل کو علم وفن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے (۲) جس عورت کا کسی بچہ نے دودھ پیا ہو وہ عورت اس بچہ کی رضاعی ماں بن جاتی ہے

علیحدہ کیا جائے۔ اسی طرح جس طالب علم کی طبیعت میں کجی (۱) معلوم ہو، سلامتی سے محروم ہو اس کو بھی ہرگز پورا نصاب نہ پڑھایا جائے کیونکہ تکمیل نصاب کے بعد وہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی اس کو عالم و مقتدا سمجھیں گے اور ایسا شخص مقتدا ہوکر جو کچھ ستم ڈھائے گا ظاہر ہے کہ پھر ان سب کا وبال ان مدرسین و مہتممین کے اوپر ہوگا کہ انہوں نے ایسے نااہلوں کو کیوں علم پڑھایا۔ میری رائے میں ایسے لوگوں کے لیے ایک مختصر نصاب اردو میں یا فارسی میں یا کسی قدر عربی میں مقرر کرلیا جائے جو ضروری مسائل واحکام کے جاننے کے لیے کافی ہو وہ نصاب پڑھا کر ان سے کہہ دیا جائے کہ جاؤ اور دنیا کا کوئی کام سیکھو اور کماؤ کھاؤ۔ مجھے حیرت ہے کہ بعض مدارس میں ایک ہزار، بعض میں پانچ سو، بعض میں سو دو سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ سب کے سب مقتداء بننے کے اہل ہیں؟ یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں، پھر اہل مدارس سب کو مقتداء کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ بخدا مسلمانوں پر زیادہ تباہی ان نااہل مولویوں کی وجہ سے بھی آئی ہے کہ ان لوگوں نے دین کو کھیل بنالیا ہے۔ جیسا موقع دیکھا ویسا فتویٰ دے دیتے ہیں، حتیٰ کہ عوام کہنے لگے کہ بس جی دین تو مولویوں کے ہاتھ میں ہے، جس چیز کو چاہیں حلال کردیں اور جس کو چاہیں حرام۔ اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انہوں نے علماء سے دریافت کرنا ہی چھوڑ دیا جس کے جو جی میں آیا کرلیا، خواہ حلال ہو یا حرام پھر اس صورت میں قہرِ خداوندی نازل ہونا ہی تھا۔

اہل مدارس سے خطاب

اس لیے میں مکرر کہتا ہوں کہ اہل مدارس کو طلبہ کا انتخاب کرنا چاہیے اور ان میں جو اہل نظر آئیں انہیں کو پوری تعلیم اور انہیں کو سند فراغ دینی چاہیے مگر اب تو بلا یہ ہے کہ لوگوں کو انتساب کا شوق ہے کہ ہمارے یہاں سے اس سال اتنے آدمی فارغ ہوئے۔ اے صاحبو! طلبہ کا فارغ کرنا بہت عمدہ ہے مگر وہ پہلے اہل اللہ تو ہوں، واللہ کس قدر افسوس ہوتا ہے جب بعض فارغین کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے اعراب بھی صحیح نہیں

(۱) ٹیڑھا پن

پڑھ سکتے حالانکہ اس پر اعراب لگے ہوئے ہیں وہ ان کو دیکھ کر بھی غلطی کرتے ہیں اور کتابوں کے اعراب تو وہ کیا خاک صحیح پڑھیں گے۔ بھلا ایسے نااہلوں کے فارغ کرنے سے کیا خوشی ہوسکتی ہے بجز اس کے کہ اپنے ذمہ خیانت کا وبال رہے اور کچھ نفع نہیں۔ صاحبو! مجھ کو سخت اندیشہ ہے کہ علماء سے خصوصاً اہل مدارس سے کہیں اس کی باز پرس خدا تعالیٰ کے یہاں نہ ہو اس کی اصلاح کی جلد فکر کیجیے۔ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا، میں یہ بیان کررہا تھا کہ طلبہ کے فضول سوالات کا جواب نہ دینا چاہیے کیونکہ بعض طلبہ محض تنگ ہی کرنا چاہتے ہیں۔

جدال فی اللہ سب سے زیادہ مذموم ہے

حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے یہاں ایک شخص پڑھتے تھے، ان کی عادت اعتراض کرنے کی بہت تھی مگر ہمیشہ ایک دعویٰ کردیا کرتے کہ یہ بات تو یوں نہیں یوں ہے، اور جب مولانا دلیل پوچھتے تو آپ کہتے کہ کیا سارا کام میں ہی کروں، دعویٰ میں نے کردیا دلیل آپ بیان کردیجیے۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت دعویٰ تھا جس کی دلیل مدعی اپنے ذمہ نہیں سمجھتے تھے۔ غرض آجکل جدال بالباطل کا بہت چرچہ ہے علماء وطلبہ میں سے کوئی بھی اس مرض سے خالی نہیں ''الا من عصم اللّٰہ'' (مگر جس کو اللہ تعالیٰ بچائے) یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے، اس میں حق تعالیٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں: وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات وصفات واحکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے، گو درجات متفاوت[1] ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم[2] ہے۔ آگے فرماتے ہیں: بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات و صفات و احکام الٰہی میں بدون علم کے اور

(۱) درجات میں فرق ہے (۲) برا۔

بدون ہدایت (۱) کے اور بدون روشن کتاب کے۔ اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احتراز یہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہوسکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو، بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعیہ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہوسکے۔ پس یہاں علم سے خاص علم یعنی علم صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا اور جو شخص علم صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل، جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم (۲) ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوگئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انہوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کرلیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے۔ خوب سمجھ لو جب علم کی ضرورت معلوم ہوگئی۔

بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کا طریق

تو اب میرا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیے اور اس کی

(۱) بغیر علم و ہدایت کے (۲) تسلیم شدہ

طرف پوری توجہ کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ کی طرف تو توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں، اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے زکوٰۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو برا کوئی نہیں کہتا حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے جیسا کہ نماز روزہ وغیرہ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ مولوی بن جاویں اور میرا یہ مطلب کیونکر ہوسکتا ہے میں تو ابھی اہل مدارس کو مشورہ دے چکا ہوں کہ وہ سب طلبہ کو مولوی نہ بنایا کریں تو جب میں سب طلبہ کا مولوی ہونا پسند نہیں کرتا تو عوام کا مولوی ہونا میں کیوں چاہوں گا۔ پس آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ آپ کو مولوی بننا پڑے گا بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ مسائل واحکام شرعیہ کا علم بقدر ضرورت اردو زبان میں ہی حاصل کرلیا جائے اور بچوں کو اہتمام کے ساتھ مکتب میں قرآن اور دینی رسائل پڑھنے کے لیے بھیجا جائے۔ جب وہ بقدر ضرورت مسائل سے واقف ہوجائیں پھر تمہیں اختیار ہے جس کام میں چاہو لگاؤ اور جو رؤساء کے بچے ہیں جن کو خدا نے مالی وسعت عطا فرمائی ہے ان کو چاہیے کہ علم دین کی پوری تعلیم دی جائے کیونکہ ان کو معاش کی فکر سے خدا نے بچایا ہے تو اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہیے کہ یہ لوگ دین کی خدمت کریں اور اگر پوری تعلیم نہ دی جائے تو کم از کم قرآن اور اردو کے ضروری دینی رسائل تو ان کو ضرور پڑھا دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مذہب سے تو کسی قدر واقف ہوجائیں اور جو لوگ اردو بھی نہ پڑھ سکیں جیسے گاؤں کے کاشتکار وغیرہ ان کو چاہیے کہ علماء سے ملتے رہیں اور مسئلے پوچھتے رہیں۔ اگر وہ روزانہ ایک مسئلہ بھی یاد کرلیا کریں تو سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے یاد ہوسکتے۔

مستورات کے لیے طریق تحصیل علم دین

رہ گئی عورتیں ان کو مرد تعلیم دیا کریں اور جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہہ دیا کرو ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ لیجیے اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیض یاب ہوسکتی ہے

اور جو لوگ اردو بھی پڑھ سکتے ہیں ان کو علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہیے کیونکہ بعضی بات کتاب سے حل نہیں ہوتی، علماء سے زبانی دریافت کر کے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔

صاحبو! آج کل علم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اول تو مخالفین اسلام جاہل مسلمانوں کو طرح طرح سے بہکاتے پھرتے ہیں پھر خود مسلمانوں میں بعضے فرقے ایسے موجود ہیں جو ظاہر میں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں مگر وہ واقع میں اسلام سے دور ہیں اور بعضے گو مسلمان ہیں مگر گمراہ ہیں تو بعضے جاہل مسلمان ان گمراہ لوگوں کی باتوں کو اسلام کی باتیں سمجھنے لگتے ہیں اور دھوکے میں پڑ جاتے ہیں۔ پھر جو جماعت اہل حق کی کہلاتی ہے ان میں بھی بعضے ایسے ہیں جنہوں نے دنیاوی اغراض کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے کہ جس کام کے ساتھ ان کی دنیوی غرض متعلق ہوئی اس کو انہوں نے دین کا لباس پہنا کر عوام کے سامنے ظاہر کر دیا اور جس چیز کی ممانعت سے ان کی اغراض میں خلل پڑتا ہو اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے اسی لیے وہ بہت سی باتوں کو جن کو پہلے جائز کہتے تھے آج حرام کہنے لگے اور جن باتوں کو ہمیشہ سے حرام و ناجائز کہتے تھے آج اس کی حرمت کو ظاہر نہیں کرتے۔

غرض پرستی کے بھیانک نتائج

صاحبو! یہ غرض وہ چیز ہے جس میں انسان دین سے اندھا بن جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد
چوں دہد قاضی بدل رشوت قرار کے شناسد ظالم از مظلوم زار(۱)

یعنی جب قاضی کے دل میں رشوت کی طمع ہوگی اس سے صحیح فیصلہ کی امید بیکار

(۱) ''جب غرض آجاتی تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور دل کی جانب سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ جب قاضی رشوت لینے کی دل میں ٹھان لیتا ہے تو ظالم اور مظلوم میں امتیاز نہیں کر سکتا''

بلکہ دور از کار ہے۔ شاید یہاں کسی کو یہ سوال پیدا ہو کہ پھر ایسے لوگوں کو تم اہل حق کیوں کہہ رہے ہو۔ سو سن لیجیے کہ میں نے ان کو اہل عقائد کے لحاظ سے کہا ہے کہ ابھی تک شکر ہے ان کے عقائد صحیح ہیں، اگرچہ اس غرض پرستی کے ساتھ عقائد کا بھی سخت اندیشہ ہے۔ چنانچہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ اہل حق کی جماعت کے بعض افراد ان اہل بدعت اور ملحدین کے ساتھ باہم شیر وشکر ہو رہے ہیں جو ان کو کافر کہتے تھے اور یہ ان کو فاسق و فاجر کہتے ہیں۔ پس حب فی اللہ وبغض فی اللہ (۱) کا اثر تو ابھی سے مٹ چلا ہے، آگے خدا حافظ ہے۔ غرض اہل حق میں سے بعض ہم جیسے بھی ہیں جنہوں نے دین کو اغراض کے تابع کر رکھا ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ آخر مصلحت وقت بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ بعض علماء سے آج کہا گیا کہ عوام بعض امور میں شریعت کی حد سے بہت دور نکل گئے ہیں اس کی روک تھام ہونی چاہیے تو وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جوش وخروش میں ایسا بھی ہو جاتا ہے، کچھ پروا نہیں اس وقت تو کام ہونے دو پھر بعد میں بھی مسائل کو دیکھ لیا جائے گا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون اے صاحبو! آسمان نہیں پھٹ جاتا، زمین شق نہیں ہو جاتی جب ایک عالم کی زبان سے یہ بیہودہ کلمات نکلتے ہیں۔ افسوس مسلمان کی مصالح پر ایسی نظر بالخصوص ایک عالم کی نہایت شرم کی جگہ ہے۔ مسلمان کو تو مصالح کے بارے میں یہ کہنا چاہیے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وخم طرہ یارے گیرند (۲)

ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ

بس ساری مصلحتوں اور تدبیروں کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو راضی کر لو سب کام بن جائیں گے، ذرا اس تدبیر کو اختیار کر کے تو دیکھو اسی میں وعدہ ہے مال و جاہ عزت وشوکت وغیرہ حاصل ہونے کا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ

(۱) اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے عداوت (۲) "یعنی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک محبوب حقیقی کے ہو رہو"

خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (۱)

استخلاف کی غایت

اس آیت میں استخلاف في الارض (۲) کا وعدہ ایمان واعمال صالحہ پر مرتب فرمایا ہے اور اس استخلاف کی غایت بھی تمکین دین وعبادت مع التوحید (توحید کے ساتھ عبادت کرنے اور دین پر جمنے کو قرار دیا) بیان فرمائی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ استخلاف فی الارض مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود بالذات ایمان و اعمال صالحہ واتباع احکام ہیں، اس کے استحکام وحفاظت کے لیے سلطنت عطا فرمانے کا بھی وعدہ ہے۔ پس یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج کل مقصود بالذات کو تابع اور تابع کو متبوع بنایا جارہا ہے۔ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۳)

اس آیت میں عباد صالحین کے لیے وراثت ارض کا وعدہ ہے تو مسلمان کو ان آیات پر نظر کرکے احکام کا اتباع کرنا چاہیے اور تمام مصالح کو تابع احکام بنانا چاہیے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ گو کسی وقت ظہور وعدہ میں دیر ہوجائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تباہی کے لیے بددعا فرمائی تھی: رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَهُ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا

(۱) وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور کیے انہوں نے اچھے کام کہ ضرور ضرور خلیفہ بنائے گا ان کو زمین میں جیسے خلیفہ بنایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور ضرور تمکین دے گا ان کے لیے ان کے دین کو وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا اور ضرور ضرور بدلے میں دے گا ان کو بعد ان کے ڈرنے کے اور عبادت کریں گے وہ میری اور نہ شریک کریں گے وہ میرے ساتھ کسی چیز کو'' النور: ۵۵ (۲) زمین میں خلیفہ بنانے کا وعدہ (۳) ''اور بتحقیق ہم زبور میں نصیحت کے بعد کہہ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے'' الانبیاء: ۱۰۵

يُؤْمِنُوا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ (۱)

آمین کہنے والا دعا میں شریک ہوتا ہے

اس دعا کے بعد حق تعالیٰ کا فورا یہ ارشاد ہوا: قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی موسیٰ وہارون علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارونؑ اس دعا پر آمین کہہ رہے تھے اور آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہونا ہے۔ دعا قبول کرلی گئی سوتم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو (۳) اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔ پس باوجود یہ کہ دعا قبول ہوچکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فورا دیدی گئی تھی مگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا۔ مفسرین نے وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھیے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے، مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہوسکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں، ہرگز نہیں! بلکہ وہ اول منضج (مادہ کو پکا کرنے والی دوا) کا نسخہ لکھے گا، مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا، اس کے بعد وقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل (۴) دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہوگی، پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملین شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہوگا۔ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ

(۱) اور موسیٰ علیہ السلام نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہم کو یہ بات کشف اور وحی کے ذریعے سے معلوم ہوگئی کہ آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال و دنیوی زندگی میں دیئے۔ اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں (پس جب ہدایت ان کے مقدر میں ہے نہیں اور جو حکمت تھی وہ حاصل ہوچکی تو اب ان کے اموال ونفوس کو کیوں باقی رکھا جائے۔ پس اے ہمارے رب ان کے مالوں کو نیست و نابود کردیجیے (جس سے ہلاکت کے مستحق ہوجاویں) سو یہ ایمان نہ لانے پاویں (بلکہ روز بروز ان کا کفر ہی بڑھتا رہے) یہاں تک کہ عذاب الیم (کے مستحق ہوکر اس (کو دیکھ لیں) یونس: ۸۸) (۲) یونس: ۸۹ (۳) ثابت قدم رہو (۴) دست آور دوا۔

صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آجاویں، سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا۔ ایک جاہل طبیب نے ایک شخص کو مسہل دیا تھا نہ معلوم جمال گوٹہ دے دیا تھا یا کیا، اس کو بے حد دست آنے شروع ہوئے، لوگوں نے طبیب صاحب سے کہا کہ دست بہت آگئے، اب بند کر دینے چاہئیں، کہا نہیں ابھی اور آنے دو مادہ نکل رہا ہے، کچھ دیر کے بعد لوگ پھر آئے کہ حکیم جی ضعف بہت ہو گیا، دست بند ہی نہیں ہوتے، کہا کچھ حرج نہیں مادہ فاسدہ نکل رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع دی کہ وہ تو مرنے کو ہو رہا ہے، کہا نہیں جب مادہ نکل جائے گا خود اچھا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ اسی میں مر گیا، لوگوں نے حکیم صاحب سے کہا کہ وہ تو مر بھی گیا تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے نکلنے میں تو یہ حال کیا کہ مار ڈالا اگر رہتا تو کیا حال ہوتا۔ اس احمق سے کوئی پوچھے کہ موت سے آگے کیا ہوتا۔ تو آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ ہم کو ایسا ہی مسہل دیا جائے لیکن محقق طبیب ایسا کبھی نہیں کر سکتا وہ ہر کام کو موقع اور وقت دیکھ کر کرے گا اگر تم اس سے یہ جا کر کہو کہ ہم نے کل نسخہ پیا تھا آج دست نہیں ہوئے تو وہ نسخہ لیکر پھاڑ ڈالے گا۔ میری غرض اس مثال سے یہ ہے کہ بعض دفعہ تاخیر ظہور میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اور حقیقت میں وہ تاخیر تمہارے ہی واسطے مصلحت ہوتی ہے، مگر چونکہ ہم کو اپنی مصلحت کا بھی علم نہیں ہوتا اس لیے وہ تاخیر ناگوار ہوتی ہے۔ پس جن مصالح کیوجہ سے تم احکام الٰہیہ کو پامال کر رہے ہو وہ مصالح خود اتباع احکام پر موقوف ہیں۔ یاد رکھو مسلمانوں کو تو ہرگز اس طرح فلاح حاصل نہیں ہو سکتی کہ وہ احکام الٰہیہ کو مصالح کے تابع بنادیں اور دنیوی اغراض کو قبلہ و کعبہ بنالیں۔ باقی کفار کی حالت دیکھ کر تم کو دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ وہ خدا کو ناراض کر کے بھی ترقی کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کفار خدا کے نزدیک حقیر ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے پیر کا جوتہ۔ اگر جوتہ میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکا نہیں جاتا اور مسلمان خدا کے نزدیک محبوب ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹوپی، کہ اس میں اگر ذرا سی بھی ناپاک چھینٹ پڑ جاتی ہے تو اس کو فوراً سر سے اتار کر پھینکتے ہیں تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ کو بھی نعوذ باللہ جوتہ کی طرح بنادیں کہ آپ برابر گندگی میں ملوث رہیں اور آپ کو اتار کر نہ

پھینکا جائے۔ صاحبو! حق تعالیٰ آپ کو ٹوپی کی طرح معزز بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کی عزت یہی ہے جہاں ذرا اس میں ناپاکی لگ جائے فوراً سر سے اتار دی جائے۔ پس خوب سمجھ لو کہ ترک احکام کے ساتھ یا احکام کو اغراض و مصالح کا تابع بنا کر مسلمان کو کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر بالفرض حاصل ہوجائے تو رضائے الٰہی تو ہرگز حاصل نہ ہوگی کہ خود فلاح سے بھی وہی مقصود ہے، کیونکہ فلاح دنیوی بھی وہی محمود ہے جو معین ہوجاوے۔ رضائے حق میں چنانچہ: الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (۱) خود اس پر شاہد بین ہے۔

مسلمان کی اصل کامیابی

پس مسلمان کی اصل کامیابی رضائے حق ہے اور اس کی اصل کوشش اس کی طلب ہے جس کا طریق اتباع احکام ہے خواہ دنیا میں کسی حال میں رہے اور اس حالت میں جو حظ اور راحت (۱) مومن کو ہوتی ہے وہ سب کامیابیوں سے بڑھ کر ہے اسی بناء پر حق تعالیٰ نے ایمان و اعمال کے ثمرات میں راہ حق پر ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے: أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۲)

صراط مستقیم ہونے کا نفع

یہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی جزاء میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزاء دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے۔ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزاء اخروی یعنی واقع فی الاخرۃ ہے وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۳) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمان کے لیے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا

(۱) ''یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دیں تو قائم کریں گے نماز کو اور زکوٰۃ دیں گے'' الحج:۴۱
(۱) لذت و راحت (۲) ''یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں'' لقمان: ۵ (۳) ''اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں''۔

یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے جس کا مشاہدہ مجھ کو ایک سفر میں اس طرح ہوا کہ ایک بار میں سہارنپور لکھنؤ جارہا تھا اس لیے رڑکی جانے والی گاڑی میں سوار ہوا تو وہاں میرے ایک دوست بھی بیٹھے ہوئے ملے جو پورے جنٹلمین تھے۔ جب گاڑی چھوٹ گئی تو آپس میں باتیں ہونے لگیں، میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں، بولے کہ میرٹھ جارہا ہوں لیکن افسوس ہے یہ گاڑی لکھنؤ جارہی ہے۔ وہ غلطی سے بجائے میرٹھ کی گاڑی کے اس میں بیٹھ گئے تھے۔ بس یہ سن کر ان کی یہ حالت ہوئی کہ چہرہ سے پریشانی ٹپکتی تھی، بات نہیں کرسکتے تھے، سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بالکل بیک بینی و دوگوش (۱) تھے، کیونکہ جنٹلمینوں میں یہ بھی مرض ہے کہ وہ سفر میں نہ کپڑے ساتھ لیتے ہیں، نہ پانی پینے کا برتن ساتھ لیتے ہیں۔

جنٹلمینوں کا عجیب مرض

ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی سکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آرہا تھا، میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس میں گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے، وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے۔ میں اس پر خاموش ہورہا، تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا، تو اب ان کا مارے پیاس کے برا حال تھا، بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی تکتے تھے، آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کرکے سوتا بن کر لیٹ رہا، تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس سے منہ لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف، بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا، میرے جی میں آیا کہ فورا اس کا ہاتھ پکڑلوں مگر میں نے خیال کیا کہ بے چارہ پیاسا ہے جب پانی پی چکے گا پھر سمجھاؤں گا۔ چنانچہ جب وہ خوب پانی پی چکے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑلیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا؟ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑگیا (۲)

(۱) بے سروسامان (۲) مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہوگئے۔

اور معافی چاہنے لگے، میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں، میں کہتا رہا اور وہ خاموش سنتے رہے۔

غرض کچھ سردی کا بھی خیال تھا مگر زیادہ پریشانی یہ تھی کہ بے راہ جارہے تھے، کہیں لاحول پڑھتے ہیں، کہیں انا للہ پڑھتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ میاں اب تو جو ہونا تھا ہوگیا، یہ گاڑی ظاہراً رڑکی سے پہلے تو ٹھہر نہیں سکتی خواہ تم کتنے ہی پریشان ہو اس لیے پریشانی بے فائدہ اطمینان سے باتیں کرو۔ تو ان کو باتوں میں لگانا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے جھنجھلاتے تھے کہ واہ میاں تم کو ہنسی سوجھی ہے اور مجھے اپنی الجھن لگی ہوئی ہے۔ اس حکایت سے میرا مقصود یہ ہے کہ میں نے اس وقت اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ کیا تھا تو یہ ظاہر ہے کہ رڑکی پہنچنے سے پہلے نہ میں لکھنؤ پہنچا تھا نہ ان کو میرٹھ جانا کچھ زیادہ دشوار ہوگیا تھا، لیکن پھر میں اپنے آپ کو ایسا مطمئن پاتا تھا گویا کہ بادشاہ تھا کیونکہ مجھ کو اس خیال سے راحت تھی کہ میں راہ پر ہوں اور وہ ایسے پریشان تھے جیسے کوئی مجرم پنجرہ میں قید کردیا جائے۔ ان کو اس خیال سے الجھن تھی کہ میں راہ پر نہیں ہوں۔ اسی طرح جو لوگ پیادہ سفر کرتے ہیں جب وہ راستہ بھولتے ہیں اس وقت کوئی ان کی پریشانی دیکھے کہ ایک ایک قدم من بھر کا ہوجاتا ہے، چلنا دشوار ہوجاتا ہے، اب تو آپ سمجھ گئے کہ واقعی ہدایت پر ہونا بڑی نعمت ہے۔

شریعت پر عمل کرنے والا بادشاہ ہے

خدا کی قسم جو شخص شریعت کے موافق چل رہا ہو وہ بادشاہ ہے، گو ظاہر میں سلطنت نہ ہو، اور جو شخص شریعت سے ہٹا ہوا ہو وہ پنجرہ میں مقید ہے، گو ظاہر میں بادشاہ ہو۔ مسلمان متبع شریعت کو چونکہ یقین ہے کہ میں سیدھے راستہ پر ہوں اس لیے اس کو ساری مصیبتیں سہل معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ چند دن کی مصیبتیں ہیں پھر ختم ہوجائیں گی۔ کفار کو یہ دولت نصیب نہیں کیونکہ ان کو اپنی نجات کا کسی صحیح دلیل سے یقین ہی نہیں اور باطل کا خاصہ یہی ہے کہ اسے اطمینان وسکون کبھی حاصل ہوتا ہی نہیں، ہاں کوئی جہل مرکب میں مبتلا ہو تو اور بات ہے مگر اس کو بھی اہل حق کے برابر ہرگز اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مصائب کے وقت جس قدر استقلال اہل حق میں ہوتا ہے کسی جماعت میں نہیں ہوتا۔

صاحبو! راستہ تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرو، احکام کا اتباع کرو، شریعت میں گڑبڑ نہ کرو، ان شاء اللہ تعالیٰ پھر کسی کی مجال نہیں کہ مسلمانوں کو نگاہ بھر کر بھی دیکھ سکے، باقی جو راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے اس کی تو یہ حالت ہے:

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستانست(۱)

سلطنت تقرب الی اللہ کا سبب نہیں

خدا کی قسم اگر ہم کو پاخانہ اٹھانا پڑے اور خدا ہم سے راضی ہو تو وہی ہمارے لیے سلطنت ہے اور اگر خدا راضی نہ ہو تو لعنت ہے ایسی سلطنت پر جو خدا کو ناراض کر کے حاصل کی جاوے۔ یاد رکھو سلطنت کوئی تقرب الی اللہ کا سبب نہیں۔

بعض انبیاء علیہم السلام ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو ساری عمر سلطنت نصیب نہیں ہوئی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ صرف ایک آدمی ہی ہوگا اور بعض کے ساتھ ایک بھی نہ ہوگا، تو کیا سلطنت نہ ہونے سے ان انبیاء کے درجہ میں کوئی کمی آ گئی، اگر محض سلطنت کوئی قرب کی چیز ہوتی تو فرعون بڑا مقرب ہونا چاہیے جس نے چار سو برس تک نہایت شان وشوکت کے ساتھ سلطنت کی تھی۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ واللہ اس نبی کے مرتبہ کے سامنے جن کے ساتھ صرف ایک آدمی ہوگا یا ایک بھی نہ ہوگا سلطنت فرعون کی کچھ بھی حقیقت نہیں، اتباع احکام کی دولت کے سامنے سلطنت بھی کوئی چیز ہے کہ اس کی مصلحت سے دین میں تصرف کیا جاوے اور احکام کو مصالح ملکی کا تابع بنایا جاوے ہرگز نہیں۔

الغرض ہماری حالت یہ ہے یا تو بعضوں کو علم نہیں وہ تو جہالت کی وجہ سے گناہوں میں زیادہ مبتلا ہیں اور بعضوں کو علم حاصل ہے تو علم صحیح حاصل نہیں انہوں نے غلط باتوں کو دین سمجھ رکھا ہے اور جن کو علم صحیح بھی حاصل ہے انہوں نے اس کو اغراض ومصالح کے تابع بنا رکھا ہے۔

ایک پردیسی مولوی کی حکایت

میں نے اسی سفر میں ایک پردیسی مولوی صاحب کو دیکھا کہ پہلے ان کے لڑکے

(۱) ''اے اعرابی مجھ کو اندیشہ ہے کہ تُو کعبہ نہ پہنچے گا اس لیے کہ جو راستہ تُو نے اختیار کیا ہے ترکستان کا ہے''

انگریزی پڑھتے تھے، اول تو یہی ان کو زیبا نہ تھا کہ مولانا ہوکے اپنی اولاد کو انگریزی پڑھاویں لیکن خیر اگر انہوں نے یہ سمجھ کر دنیوی ضرورتوں کے لیے اس کا پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ درستی دین کا اہتمام کرلیا جاوے اور اس کا اہتمام انہوں نے کرلیا ہوگا کیونکہ خود عالم تھے، تو اب سنیے قوم نے ان پر دباؤ ڈالا کہ انگریزی سکولوں میں لڑکوں کو پڑھانا موالات میں داخل ہے اپنے لڑکوں کو اٹھاؤ، آخر انہوں نے مجبور ہوکر لڑکوں کو وہاں سے اٹھالیا اور اپنے وطن بچوں کو بھیج دیا اور وہاں بھی ان کو انگریزی ہی پڑھائی، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اگر تم نے لڑکوں کو اسکول سے اس لیے اٹھایا تھا کہ انگریزی پڑھنا پڑھانا حرام ہے تو پھر تین سو کوس پر ان کو بھیج کر انگریزی ہی کیوں پڑھائی اور اگر تمہارے نزدیک انگریزی پڑھانا جائز تھا تو پھر محض قوم کے کہنے سے ایک جائز کام کو ترک کرنا اور لوگوں کی خوشامد کے لیے ان سے دبنا یہ کب مناسب تھا، بھلا خدا کا طالب ہوکر مخلوق کی رضاجوئی کرے اور خوشامد کرکے ان سے دبے طالب کی یہ شان نہیں ہوا کرتی، واللہ اہل علم کا تو یہ حال ہونا چاہیے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زور گنج بصد حشمت قاروں باشی(۱)

حرص وطمع کا انجام

ان کو اپنی فقیری میں مست رہنا چاہیے اور کسی مالدار یا رئیس سے دین کے معاملہ میں طمع یا ملامت کی وجہ سے نہ دبنا چاہیے اور اگر کوئی برا بھلا کہے تو کہنے دو، اس کی ہرگز پروا نہ کرو، خدا کے طالب ہوکر کسی کی ملامت وطعنہ کی پروا نہ ہونی چاہیے ہاں اگر کسی جگہ خوف کی صورت ہو تو شریعت سے استفتاء کرو اگر وہ موقع خوف میں درجہ اکراہ سمجھ کر تم کو معذور سمجھے تو دبنے کا بھی مضائقہ نہیں لیکن طمع اور حرص اور خوف کے لوگوں میں بھی عزت نہیں ہوتی۔ خدا کی قسم جن عوام کی یہ پرواہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ لگے لپٹے رہیں ہم کو چھوڑ کر الگ نہ ہوجاویں، اول یہ لوگ انہی کی نظروں سے گرتے ہیں

(۱) ''اے دل وہ بہتر ہے کہ سرخ شراب وعشق الٰہی سے تُو مست رہے بغیر سونے چاندی کے خزانوں کے تُو دولت مند بن جائے گا''۔

کیونکہ حرص وطمع چھپی نہیں رہتی اور حریص کی عزت لوگوں کی نظروں سے گر جاتی ہے۔

بئس المطاعم حين الذل تكسبها القدر منتصب والقدر محفوض (۱)

ایک لطیفہ شب دیگ

ایک لطیفہ یاد آیا۔ لکھنؤ میں ایک کھانا پکتا ہے جس کو شب دیگ کہتے ہیں، ایک طالب علم نے اس کا ترجمہ لیلة القِدر (بکسر القاف) (رات کی دیگ) کیا تھا، شب کا ترجمہ لیلہ اور دیگ کا ترجمہ قدر، بس لیلۃ القدر بن گیا۔ خوب سوجھی لیلۃ القَدر (شب قدر) تو سنا کرتے تھے۔ اس نے لیلۃ القِدر بھی ایجاد کردی۔ خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا۔ مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حال میں احکام شرعیہ کو اپنا رہنما بنانا چاہیے خواہ مال ملے یا نہ ملے، جاہ حاصل ہو یا نہ ہو، طعنے سننے پڑیں یا تعریف کسی بات کی پرواہ نہ کرنی چاہیے، کسی کے برا کہنے سے انسان برا نہیں ہوجاتا اور کسی کے بھلا کہنے سے اچھا نہیں ہوجاتا۔ یاد رکھو اگر تم خدا کے نزدیک اچھے ہو تو چاہے ساری مخلوق تم کو کافر و فاسق و زندیق کہے کچھ اندیشہ کی بات نہیں اور اگر خدا کے نزدیک مردود ہو تو چاہے ساری دنیا تم کو غوث وقطب کہے اس سے کچھ بھی نفع نہیں پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اہل حق کو اگر آج برا کہا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن پھر ان کو اچھا کہا جائے گا، اور اہل باطل کی اگر آج مدح ہوگی تو کسی دن ان کی قلعی ضرور کھلے گی اور ان کے معتقدین ہی ان کو برا بھلا کہیں گے۔

شیخ ابن عربی کا مقام

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگوں نے کافر و زندیق کہا، حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر سالہا سال پاخانہ ان کی قبر پر پڑتا رہا تو کیا جہلاء کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا؟ ہرگز نہیں، تو اگر آج تم کو بھی لوگ برا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربی امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی۔ إذا دخل السين في الشين ظهر الميم سین سے مراد سلطان سلیم ہے

(۱) ''وہ کھانا بہت برا جس کو ذلت سے کھایا جاوے، انجام کار یہ ہوگا کہ ہانڈی تو چڑھی ہوئی ہوگی اور عزت گری ہوئی قدر کی مناسبت ہے''۔

اور شین سے مراد ملک شام ہے اور میم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام میں داخل ہوں گے اس وقت محی الدین بن عربی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا اور اس پر قبہ تعمیر کیا، اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔

امام غزالی کی وقعت وعظمت

امام غزالیؒ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے، ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہوگئی؟ ہرگز نہیں، اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں، ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر و زندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ بہت کچھ تھی خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔ پھر اگر اتباع احکام کی وجہ سے لوگ تمہارا ساتھ چھوڑ دیں اور تم کو سب کے سب برا بھلا کہنے لگیں تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے، بہت سے بہت جاہ زائل ہوجائے گی، بدنام ہوجاؤ گے، سو یہ کوئی نقصان نہیں بلکہ عین منفعت ہے کیونکہ شہرت اور جاہ یہ وہ بلا ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے، دینی ضرر تو یہ ہے:

اشتہار خلق بند محکم است — بند ایں از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجور ساز وزار زار — تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اینت گوید نے منم انباز تو — آنت گوید نے منم ہمراز تو
اوچو بیند خلق را سر مست خویش — از تکبر میرود از دست خویش(۱)

جب آدمی دیکھتا ہے کہ ساری دنیا مجھ پر فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہوجاتا ہے اپنے اوپر نظر کرنے لگتا ہے۔ آخر کار اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہوجاتا

(۱) ”مخلوق کی شہرت اللہ اور اس کے بندے کے درمیان مظبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کب کم ہے اپنے آپ کو رنجور اور گم نام رکھو تا کہ لوگ تم کو شہرت سے باز رکھیں۔ ایک کہہ رہا ہے میں آپ کا ہم راز ہوں دوسرا کہتا ہے نہیں صاحب میں آپ کا شریک حال ہوں وہ شخص بیچارہ جب ایک مخلوق کو اپنا سرمست اور عاشق دیکھتا ہے پس تکبر کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔

ہے۔ افسوس بہت لوگ اس ورطہ میں آکر ہلاک ہوگئے یہ تو دین کا ضرر ہوا، دنیا کا ضرر یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

خشمہاؤ چشمہاؤ رشکہا برسرت ریز و چو آب از مشکہا(۱)

یعنی مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہوجاتے ہیں پس صاحب جاہ کو نہ دین کی راحت ہے نہ دنیا کی، اس کا دین کبھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے، ہاں جب حق تعالیٰ کی طرف سے بدون تمہاری طلب کے جاہ عطا ہو وہ نعمت ہے اس میں دین کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ ادھر سے تمہاری حفاظت کی جاتی ہے، ہاں بعض دفعہ امتحان کے طور پر دنیوی خطرات ایسے شخص کو بھی پیش آجاتے ہیں لیکن جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے وہ خطرات سے گھبرایا نہیں کرتا، وہ سب کو خوشی کے ساتھ برداشت کرلیتا ہے۔

علم حقیقی کی شان

الغرض جاہ کا طالب ہونا بہت برا ہے اور طلب کے بعد جو جاہ(۱) حاصل ہوتی ہے اس کی وہی حقیقت ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے پھر یہ ساری عزت و جاہ محض خیالی چیز ہے اس سے تم میں کیا کمال پیدا ہوگیا۔ مرگئے تو کچھ بھی نہیں اب تم مخلوق کی نظر میں اچھے ہوئے تو کیا، برے ہوئے تو کیا، پس آج کل عموماً ایسا ہی علم لفظی واسمی دیکھا جاتا ہے جو جاہ طلبی میں برباد کیا جاتا ہے، حالانکہ واللہ علم وہ جوہر ہے کہ اس میں خود ایسی لذت ہے جس کے سامنے سلطنت اور مال و دولت اور جاہ وعزت سب ہیچ ہے مگر ایسا علم محض کتاب خوانی سے میسر نہیں ہوتا۔

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا(۲)

یہ علم تو اس طرح حاصل ہوگا:

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو(۳)

علم حقیقی حاصل کرنے کا طریق

اگر یہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو کسی کی جوتیوں میں جاکر پامال ہوجاؤ، اگر

(۱) غصے اور آنکھیں اور رشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے" (۱) ایک مرتبہ (۲) "محض کنز و ہدایہ پڑھتے خدا تعالیٰ کو نہیں پاسکتے" (۳) قال کو چھوڑ و حال پیدا کرو اس حال کو پیدا کرنے کے لیے کسی کامل مرد کی جوتیوں میں جاکر پامال ہو"۔

وہ سر پر جوتے بھی مارے تو خوش رہو پھر چند روز کے بعد دیکھنا کہ تمہارے دل میں کیسا استغناء پیدا ہوتا ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا لیکن آج کل یہی بات تو نہیں رہی، مولوی اول تو اہل اللہ کے سامنے جاتے نہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم عالم ہو گئے، اب ہم کو کسی کی کیا ضرورت ہے اور اگر کبھی پیر کی تلاش کا خیال ہوگا اور کسی کے پاس جاویں گے تو ایسی جگہ تلاش کریں گے جہاں ان کی قدر ہو اور مشائخ بھی علم کا ادب کر کے علماء کی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ اب یہ حضرت اس کے منتظر ہوتے ہیں کہ پیر صاحب مجھے خلافت عطا فرمادیں۔ پھر غضب یہ ہے کہ بعضے پیر بھی آج کل ایسے ہیں جو یہ سمجھ کر کہ یہ عالم ہم سے وابستہ رہیں گے تو ان کی وجہ سے ہمارا سلسلہ بڑھے گا، ایسوں کو خلافت بھی دے دیتے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ ایسے طالب بھی خائن ہیں اور ایسے پیر بھی خائن ہیں۔ بھلا اگر کسی مریض کو آپریشن کی ضرورت ہو اور ڈاکٹر اس خیال سے کہ یہ مریض مجھ سے خوش رہے گا تو زیادہ انعام دے گا، بجائے آپریشن کے اس کے زخم پر مرہم لگا دے تو کیا وہ ڈاکٹر خائن نہیں؟ یقیناً اس نے خیانت کی اور بڑا ظلم کیا۔ پس اے وہ شیخ جو کہ مریدوں کے مکدر ہوجانے کے خوف سے ان کے امراض پر متنبہ نہیں کرتا خدا کے واسطے تُو ان کے حال پر رحم کر، اور اے وہ ڈاکٹر جو آپریشن کی جگہ مرہم لگا رہا ہے خدا کے لیے ایسا ظلم نہ کر، ورنہ یاد رکھ کہ آج اگر یہ مریض تجھ سے خوش ہو بھی گیا تو کل کو جب یہ زخم ناسور بن جائے گا اس وقت یہ تیرے اوپر لعنت کرے گا۔ اسی طرح میں طالب سے کہتا ہوں کہ تجھ کو طبیب سے نشتروں پر صبر کرنا چاہیے، جب ہی یہ ناسور اچھے ہوسکتے ہیں:

نرم گوید گرم گوید خوش بگیر تار ہائی یابی از نار سعیر(۱)

اور اگر یہ نہیں بلکہ تم ہر ڈانٹ پر غصے ہونے لگے تو اس طرح تمہاری صحت دشوار ہے۔ بھلا اگر کسی کے ناسور ہو(۲) اور وہ نشتر (۳) کے چبھانے پر طبیب سے خفا ہونے لگے تو اس شخص کی تندرستی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔

وز بہر زخمے تو پر کینہ شوی پس کجا صیقل چو آئینہ شوی(۴)

(۱) اس کی نرمی و گرمی کو خوشی سے برداشت کرو تاکہ تم دوزخ کی آگ سے رہائی پاسکو" (۲) پھوڑا ہو (۳) آپریشن کرنے پر (۴) "اگر ہر زخم پر کینہ ہوتے ہو یعنی مرشد کی ہر تنبیہ پر ناک بھوں چڑھاتے ہو تو کس طرح قلب مثل آئینہ کے صاف ہوسکتا ہے"۔

مولانا نے اس مضمون کو ایک حکایت کے ضمن میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ایک گودنے والے کی حکایت

حکایت یہ ہے کہ ایک شخص گودنے والے کے پاس گیا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنادے، اس نے اپنا کام شروع کیا اور ایک جگہ سوئی کو لگایا، اس نے آہ کی اور اس نے پوچھا کیا بنا رہے ہو؟ کہا منہ بنا رہا ہوں، کہنے لگا کہ یہ شیر کھاوے پیوے گا تھوڑا ہی جو اس کو منہ کی ضرورت ہو بس منہ کو رہنے دو۔ اس نے دوسری جگہ سوئی کو کچ سے چبھایا، آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ کہا دُم بنا رہا ہوں، کہنے لگا بعضے دُم کٹے شیر بھی ہوتے ہیں، دُم کی ضرورت نہیں کچھ اور بناؤ اس کو رہنے دو۔ اس نے تیسری جگہ سوئی کو چبھایا، اس نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ کہا آنکھیں، بولا اس کو آنکھوں کی کیا ضرورت ہے کوئی دیکھنا تھوڑا ہی رہ گیا ہے اس کو بھی چھوڑو، اس نے چوتھی جگہ سوئی کو چبھایا، آپ نے پھر آہ کی کہ اب کیا بنا رہے ہو؟ کہا شکم (۱) کہنے لگا اونہہ! اسے شکم کی کیا ضرورت ہے کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے، تو مصور نے جھلا کر سوئی پھینک دی اور کہنے لگا:

شیر بے گوش و سروا شکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید (۲)

بندہ خدا ایسا شیر تو خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ شکم ہو، نہ منہ ہو، نہ دُم ہو، نہ آنکھیں۔ جب تجھ کو سوئی کی تکلیف پر صبر نہیں تو شیر کی تصویر ہی کیوں بنواتا ہے، جا اپنا کام کر۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن بس تو از شیر زیاں کم دم بزن (۳)

مشائخ کاملین کا مشفقانہ آپریشن

صاحبو! اگر علم حقیقی اور علم نافع حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا تو یہی راستہ ہے، یہی طریقہ ہے نشتر اور زخم کھانے پڑیں گے۔ یعنی اپنی طرف سے اس کے لیے بھی آمادہ ہونا پڑے گا، باقی اس کا میں تم کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تم اپنی طرف سے ہر طرح کی ذلت اور رسوائی کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر مشائخ کاملین تم سے سختی کا برتاؤ نہ کریں گے۔ یہ حضرات بہت رحم دل اور شفیق ہوتے ہیں، البتہ اگر تمہارے اندر عجب اور کبر کا مادہ رہا تو پھر

(۱) پیٹ (۲) ''شیر بے دم سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں پیدا کیا'' (۳) ''یعنی جب تم میں سوئی چبھنے کی طاقت نہیں ہے تو تم شیر ہونے کا دعویٰ مت کرو''۔

یہ ناسور تو آپریشن ہی سے اچھا ہوگا۔ اس کا تو یہی راستہ ہے اگر یہ راستہ پسند نہیں تو پھر تمہارا اس منزل میں آنا ایسا ہوگا جس کی بابت ارشاد ہے: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (۱)

ہر کام اصول اور انتظام ہی سے اچھا ہوتا ہے۔ خلاف اصول جو کام ہوگا خراب ہوگا۔

ضرورت علم نافع

صاحبو! میں اس علم نافع کی ضرورت آپ کو بتلا رہا ہوں یہ وہ علم ہے جو خلوص سے حاصل ہوتا ہے اس کی کوشش کیجیے اور یاد رکھیے کہ احادیث و قرآن میں جہاں علم کی فضیلتیں مذکور ہیں وہاں یہی علم مراد ہے جو خلوص کے ساتھ حاصل ہو اور جو علم طلب جاہ(۲) وغیرہ کے لیے ہو یا جو اغراض و مصالح کا تابع ہو وہ علم مراد نہیں چنانچہ اس حدیث نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے تین شخصوں کو بلایا جائے گا اول شہید پھر عالم پھر سخی۔ شہید سے سوال ہوگا کہ تُو نے ہمارے واسطے کیا کیا؟ وہ کہے گا الٰہی میں نے اپنی جان آپ کے واسطے فدا کر دی تھی۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو تم نے جان اس واسطے دی تھی تا کہ لوگ یہ کہیں کہ بڑا بہادر ہے۔ ''ليقال إنك لجري'' (تا کہ کہا جائے تُو بڑا بہادر ہے) یعنی کیسی جان دی، عدالت میں کیسا اظہار دیا، بڑی جرأت سے جواب دیا فقد قيل (تو بہادر کہا گیا) یعنی لوگوں میں بہت تعریف ہو چکی اور تمہارا مقصد پورا ہو چکا۔ پھر حکم ہوگا اس کو جہنم میں گھسیٹ کر ڈال دو۔

پھر عالم صاحب بلائے جائیں گے ان سے بھی یہی سوال ہوگا کہ تم نے ہمارے واسطے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو پڑھایا، فتوے دیے، مسئلے بتلائے۔ ارشاد ہوگا جھوٹ بولتے ہو بلکہ تم نے سب کچھ اس لیے کیا تھا تا کہ تم کو عالم کہا جائے فقد قيل (سو تم کو عالم کہا گیا) بہت لوگ آپ کو مولوی و مولانا کہہ چکے، خوب تعریفیں ہو چکیں اور تمہارا مدعا حاصل ہو چکا، پھر حکم ہوگا کہ اس کو بھی گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دو۔ اس طرح سخی کے بارے

(۱) ''اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازہ سے آیا کرو'' سورۃ البقرۃ: ۱۸۹ (۲) اقتدار طلب کرنے کے لیے ہو۔

میں وارد ہے۔ صاحبو! ریا اور حب جاہ سے بچو یہ بہت بری بلا ہے۔ اب میں علم کی اس تفسیر کے بابت جو اس آیت میں وارد ہوئی ہے کچھ عرض کر کے بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جو کچھ خدا تعالیٰ نے میرے قلب میں ڈالا ہے میں وہ بیان کردوں گا، گو اس سے بھی اچھی توجیہ ممکن ہو جس کے پاس اس سے اچھی توجیہ ہو وہ اس کو پیش کردے۔

جملہ علوم درسیہ کی ضرورت

میرے نزدیک اس آیت سے تمام علوم درسیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح کہ کتاب منیر سے مراد علم نقلی ہے کیونکہ کتاب میں اصلی نقلی ہی ہونا ہے مگر مراد مطلق علم نقلی نہیں ہے بلکہ علم استدلالی مراد ہے۔ چنانچہ علم کے مقابلہ سے اس کی تعیین معلوم ہوتی ہے اور ھدی سے مراد علم عقلی ہے کیونکہ نقلی کا مقابلہ اسی کو مقتضی ہے لیکن یہاں بھی علم استدلالی عقلی مراد ہے، مطلق عقلی مراد نہیں کیونکہ ھدی میں معنی دلالت کے ماخوذ ہیں اور استدلالی کی یہی شان ہوتی ہے اور اس سے پہلے فرمایا ہے بغیر علم (علم کے بغیر) اس سے علم ضروری مراد ہے کیونکہ اگر اس سے علم عقلی یا نقلی کسی کو مراد لیا جاوے تو تکرار لازم آئے گا اور اگر مطلق علم مراد لیا جاوے تو قسیم کا مقسم بننا لازم آئے گا۔ شق اول غیر مناسب اور شق دوم ناجائز ہے اس لیے میرے نزدیک اس سے علم ضروری مراد ہے۔

اقسام علم

پس یہاں علم کی یہ اقسام مذکور ہیں علم ضروری و علم کسبی۔ اور کسبی کی دو قسمیں ہیں: استدلالی عقلی و استدلالی نقلی، ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملایا جاوے کہ مقاصد کے مقدمات بھی مقاصد کے حکم میں ہوتے ہیں: لأن مقدمة الواجب واجب (واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے)

اب تمام علوم درسیہ اس آیت میں داخل ہو گئے کیونکہ علوم درسیہ میں بعض علوم ضروریہ ہیں اور بعض استدلالی عقلی کی قسم سے ہیں اور بعض استدلالی نقلی میں داخل ہیں اور بعض علوم ان کے لیے مقدمات ہیں جیسے نحو و صرف و بلاغت وغیرہ اسی لیے میں اس وعظ کا نام تعظیم العلم مع تقسیم العلم رکھتا ہوں۔ اگرچہ یہ نام طویل ہے مگر اس عنوان سے معنوں پر دلالت واضح ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ بیان یہ ہے کہ علوم شرعیہ کی سخت ضرورت ہے، اس کے حاصل کرنے کی کوشش کیجیے اگر تمام علوم درسیہ کی تحصیل دشوار ہو تو بقدر ضرورت ہی حاصل کر لیجیے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد بے فکر نہ ہو جانا کیونکہ مقصود محض علم ہی سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ علم اس مقصود کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے اصل چیز کچھ اور ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

ایں ہمہ گفتیم ولیک اندر بیچ بے عنایات خدا ہیچم و ہیچ(۱)

اصل مقصود جب حاصل ہوگا، جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کی کشش اور آپ پر عنایت ہوگی۔ چونکہ مولانا شیخ اور مربی ہیں اس لیے آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ تم ان عنایات الٰہیہ کے مورد کیونکر ہو سکتے ہو۔

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق(۲)

یعنی خدا تعالیٰ سے بلا واسطہ تعلق حاصل نہیں ہو سکتا یہ عادۃ اللہ کے خلاف ہے بلکہ خاصان حق کے ذریعے سے تعلق ہو سکتا ہے پھر تم بھی ان کی طرح مورد عنایات ہو جاؤ گے اور نصرۃ الٰہی تمہارے ساتھ ہو جائے گی۔ خاصان خدا سے جدا رہکر توفیق الٰہی تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتی، خوب سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ خاصان حق سے طریقہ اور تدبیر سیکھو اور خدا تعالیٰ سے دعا کرو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کامیابی میں دیر نہ ہوگی۔ اب دعا کیجیے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم و عمل مستقیم کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اس کے بعد حضرت حکیم الامت دام مجدہم نے تھوڑی دیر تک حسب عادت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ پھر اہل مدرسہ کے اصرار پر طلبہ کو انعام اور سند وغیرہ اپنے ہاتھ سے عطا فرمائی۔ اس سے فراغت پا کر جلسہ بخیر وخوبی ختم ہوا

والحمد للہ علی ذلک (جامع عفا اللہ عنہ)

---

(۱) یعنی گو ہم نے بہت سے وعظ ونصیحت کی ہے لیکن کسی کام کے پختہ ارادہ کرنے میں جب تک حق تعالیٰ کی عنایت نہ ہو ہم ہیچ ہیں" (۲) یعنی بغیر خدا تعالیٰ اور خاصان خدا کی عنایات کے اگر فرضاً فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق اعمال محض سیاہ ہوگا"

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی (ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور)

۱۔ اس ماہ ۱۱ جولائی تا ۱۶ جولائی وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیرِ اہتمام ملک بھر میں امتحانات کا انعقاد کیا گیا جامعہ میں ۴۵۷ طلباء نے وفاق المدارس العربیہ کے تحت امتحانات میں شرکت کی۔ دوران امتحان حکومت پاکستان اور وفاق المدارس کی جانب سے دیے گئے SOPs پر مکمل عمل کر کے ایک مثالی نمونہ پیش کیا جسے مختلف طبقات کی جانب سے خوب سراہا گیا، اللہ تعالیٰ مدارس اسلامیہ اور مراکز دینیہ کی ہمہ قسم کی مشکلات حل فرمائیں، ان کے منتظمین، ملازمین ومعاونین کو استقامت عطا فرمائیں، انکی خدمات کو قبول فرمائے اور دونوں جہاں میں بہترین جزاء سے نوازیں اور تا قیام قیامت دین کے ان قلعوں کو آباد وشاد رکھیں۔ آمین۔

۲۔ وبائی صورت حال کی بناء پر تعلیمی اداروں کی بندش کی وجہ سے طلباء کا جو تعلیمی نقصان ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں بالخصوص درجات حفظ میں تحفیظ کے طلباء کے اس تعلیمی نقصان کو دیکھتے ہوئے جامعہ کی انتظامیہ نے درجہ حفظ وناظرہ کی آن لائن کلاسز کا اہتمام کیا ہے جو ان شاء اللہ اس تعلیمی نقصان سے ممکنہ تلافی کا ذریعہ ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اکابرین جامعہ کی جملہ سعیات حسنہ کو قبول فرمائے۔

۳۔ رئیس الجامعہ حضرت قاری احمد میاں صاحب تھانوی دامت برکاتہم العالیہ، الحمدللہ آپ حضرات کی دعاؤں سے روبصحت ہیں وقتاً فوقتاً جامعہ میں تشریف لاتے ہیں، نقاہت اور کمزوری کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے، اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب کو صحت وسلامتی کے ساتھ بابرکت وباعافیت زندگی عطا فرمائے۔

۴۔ حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کا ستائیسواں وعظ ''اصلاح معاملات ومعاشرت'' کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے۔ خواہشمند حضرات ادارے سے وصول کر سکتے ہیں۔ اس پر فتن دور میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جامعہ کے تمام اساتذہ وملازمین عوام کی اصلاح وخدمت میں سرتوڑ محنت کر رہے ہیں۔ اپنی نجی ضروریات پر فوقیت دیتے ہوئے تحقیقی اور تصنیفی خدمات کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا ہے تمام قارئین سے خصوصی درخواست ہے کہ جامعہ کو اور اس کے متعلقین کو اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔